RGSd. L. NO.7243 Phone 8808

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1981

اس پرچہ میں :۔

قصر حکومت سے قرآن کی آواز

(معاشی نظام پر رپورٹ)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی۔گلبرگ۔لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماھنامہ لاھور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ۳۶/- روپے غیر ممالک ۴/- پونڈ	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور	۳ تین روپے

جلد ۳۴	جنوری ۱۹۸۱ء	شمارہ ۱

فہرست

۱۔ لمعات ۔۔۔۔ (۱) اقبالؒ اور عربی ممالک۔ (۲) عربوں کی نسل پرستی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲
(۳) بنگالیوں کی نسل پرستی۔ (۴) ہندوستان میں قیدیوں کو اندھا کر دیا
(۵) اسلامی قوانین کا انسائیکلوپیڈیا۔ (۶) بنگلہ دیش کا جشنِ آزادی
(۷) سیاسی پارٹیوں کے جواز میں فیڈرل شریعت کورٹ کا فیصلہ
(۸) اسلام میں قانون سازی کا اصول، سپریم کورٹ کے فیصلے کے اقتباسات
۲۔ رابطۂ باہمی۔ نمائندوں کا اجلاس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲
۳۔ عہدِ حاضر میں، سنتِ رسول اللہ کی اہمیت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۳
۴۔ سُنیئے! قرآن کی آواز کہاں سے اٹھ رہی ہے؟ (قصرِ حکومت اور قرآن) ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷
۵۔ دو قومی نظریہ، (اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی نظر میں) ۔۔۔ (محترم پرویز صاحب) ۔۔۔ ۲۴
۶۔ ایک کمیونسٹ نوجوان سے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۷
۷۔ فہرست معطیانِ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۲

اڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ۔ اشرف پرنٹنگ پریس۔ ۹ ایبک روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

۱۔ اقبالؒ اور عربی ممالک

"ندائے وقت" بابت یکم دسمبر ۱۹۸۰ء میں ریاض (سعودی عرب) کے محمد امین صاحب کے قلم سے ایک شذرہ شائع ہوا ہے جو غور و فکر کا محتاج ہے۔ اسے درجِ ذیل کیا جاتا ہے:۔

ریاض یونیورسٹی میں ۱۹ نومبر کو اسلامی فکر کی تجدید کے عنوان سے ایک سمینار ہوا جس سے سعودی عرب کے سب سے بڑے مذہبی رہنما شیخ عبدالعزیز بن باز، معروف مصری مفکر محمد قطب (سید قطب شہید کے بھائی) سوڈان کے ڈاکٹر جعفر شیخ ادریس اور معروف مؤلف اور روشن نظر عالمِ دین جناب محمد صباغ نے خطاب کیا۔ سمینار کے آخر میں سوال و جواب کا ایک پروگرام ہوا، اور اس نشست کا آخری سوال اقبالؒ کی کتاب "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامی" کے بارے میں تھا جس کا ترجمہ عربی میں "تجدید التفکیر الدینی فی الاسلام" کے نام سے موجود ہے۔ ڈاکٹر جعفر شیخ ادریس نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ اس کتاب میں کچھ باتیں قابلِ اعتراض ہیں معتدل مؤقف اختیار کیا لیکن استاذ صباغ نے اقبالؒ پر شدید تنقید کی۔ انہوں نے کہا کہ اس کتاب کی عبارتیں گمراہ کن ہیں بلکہ اس میں بعض باتیں کفر تک لے جانے والی ہیں۔ یہ انتہائی خطرناک کتاب ہے اور طلبا کو اس سے متنبہ رہنا چاہیئے۔ انہوں نے اس افسوس کا اظہار بھی کیا کہ ایسی کتابیں بغیر تعلیق اور حواشی کے نہیں چھپنی چاہیئں۔ سوء اتفاق سے جناب محمد قطب نے بھی استاد صباغ کی تائید کی اور کہا کہ اس کتاب کا پڑھنا عام طلباء کے لئے خطرے سے خالی نہیں، اس میں بہت سی باتیں خلافِ حقیقت ہیں۔ نیز یہ کہ اقبالؒ مغربی فلسفے اور خاص کر جرمن فلسفے سے متاثر ہے اور تصوف کے بعض غیر اسلامی نظریوں کا قائل ہے۔

یہ ایک ایسی تقریب کا حال ہے جو ایک علمی ادارے میں ہوئی اور جس سے عالمِ عرب کے چوٹی کے علماء اور سکالرز نے خطاب کیا۔ اسے مائیکرو ویو سسٹم پر ہزاروں طلباء اور طالبات نے دیکھا اور سنا اور اس کے مزید ابلاغ کے لئے اسے دوبارہ دکھایا اور سنایا جائے گا۔ راقم الحروف

نے اس کے خلاف ایک اختلافی نوٹ فوری طور پر یونیورسٹی کے ہفتہ وار میگزین میں دیدیا ہے جس میں مختصر طور پر اقبالؒ کی اسلامی، علمی اور فکری خدمات کا ذکر کیا گیا تھا لیکن یہ کافی نہیں ہے۔

اصل میں جو بات قابلِ افسوس ہے وہ یہ ہے کہ اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ، تحریکِ پاکستان اور نظریۂ پاکستان پر یہاں عربی میں شاید ہی کوئی کتاب ہو۔ اقبالؒ کے بعض اشعار ترجمہ شدہ موجود ہیں لیکن وہ نایاب ہیں، سنا ہے مصر میں پاکستانی سفارت خانے نے انہیں چھپوایا تھا، راقم نے سفارت خانے کو قیمتاً بھجوانے کے لکھا لیکن کسی نے خط کا جواب تک نہیں دیا، دوسری طرف گاندھی اور اس کے فلسفے پر کتابیں اور نہرو کی خود نوشت اور دوسری کتب عربی میں موجود ہیں۔ اس چیز کی انتہائی ضرورت ہے کہ اقبالؒ کی سوانح اور افکار پر جو کچھ لکھا گیا ہے اسے عربی میں بھی ترجمہ کروایا جائے۔ ان کے اشعار کے ترجمے کو یہاں عام کیا جائے، اقبالؒ کے فلسفیانہ افکار میں اگر کوئی اختلافی یا کمزور پہلو ہے تو اس کی مناسب وضاحت کی جائے۔ ان ساری باتوں کی غیر موجودگی اور صرف مذکورہ کتاب کے ترجمے کی وجہ سے یہاں کے لوگ اقبالؒ کو نہیں سمجھ سکے اور اس میں قصور ہمارا ہے، عربوں کا نہیں۔ اس لئے میں ڈاکٹر جاوید اقبال، اقبال اکیڈیمی، اقبالیات پر کام کرنے والے، دوسرے اہلِ علم بلکہ حکومتِ پاکستان سے درخواست کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کئے جائیں اور صرف اقبالؒ ہی پر نہیں بلکہ قائدِ اعظمؒ، تحریکِ پاکستان اور نظریۂ پاکستان پر بھی عربی میں کتابیں لکھوائی اور ترجمہ کروائی جائیں تاکہ عرب ممالک میں پاکستان اور نظریۂ پاکستان اور اس کے زعماءؒ کا امیج صحیح طور پر اُبھر سکے۔

خطباتِ اقبالؒ بلند پایہ، ادق مضامین پر مشتمل تصنیف ہے جو محض ترجمہ سے بمشکل سمجھ میں آسکتی ہے۔ اُس کا ترجمہ ضروری حواشی و تشریحات کے ساتھ شائع ہونا چاہیئے۔ اس میں بعض مقامات قرآنِ کریم کی رُو سے محلِ نظر بھی ہیں اُن کی وضاحت اور تصحیح کی جاسکتی ہے۔ خطبات کے علاوہ، کلامِ اقبالؒ بھی، اپنی اہمیت کے اعتبار سے منفرد ہے، اور وہ اگر صحیح معنوں میں مسلمانوں کے سامنے آجائے تو اس سے حقیقی اسلام پر پڑے ہوئے بہت سے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہؒ کا پیامِ ملّتِ اسلامیہ کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑانے کے لئے بڑا محرک ثابت ہو سکتا ہے۔ اِس نہج سے ضرورت ہے کہ اُس کا تشریحی ترجمہ مختلف زبانوں میں (بالخصوص عربی زبان میں) شائع کیا جائے۔ لیکن اِس کی توقع کس سے کی جاسکتی ہے؟ غیر زبانیں تو ایک طرف، خود اُردو میں بھی (سید نذیر نیازی کی دو ایک تالیفات کو چھوڑ کر) کوئی کتاب ایسی نہیں جسے مستند طور پر فکر اور پیغامِ اقبالؒ کا حامل قرار دیا جاسکے۔ جہاں تک عربی زبان میں تراجم کا تعلق ہے، جس زمانے میں مصر کے سفیر، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (مرحوم) پاکستان میں تعینات تھے انہوں نے ایک مختصر سی مجلس کی طرح ڈالی تھی جسے وہ "مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ" سے تعبیر کرتے تھے اور پرویز صاحب کو

شیخ قلندران کہہ کر پکارتے تھے۔ مختلف اوقات پر اس مجلس کی نشستیں سفارت خانہ مصر میں منعقد ہوتی تھیں۔ اس میں علامہ اقبالؒ کی کسی ایک کتاب کو لیا جاتا، پرویز صاحب درساً درساً اس کی تشریح کرتے اور سفیر صاحب اُن اشعار کو عربی اشعار کے قالب میں ڈھالتے۔ اِس طرح یہ سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا۔ اور مثنوی اسرار و رموز، مثنوی پس چہ باید کرد، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی تکمیل ہوگئی۔ تو ڈاکٹر غزام (مرحوم) کا تبادلہ سعودی عرب میں ہوگیا۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ ارمغانِ حجاز کی تدریس حریم کعبہ میں بیٹھ کر کی جائے گی۔ لیکن افسوس کہ اُن کی مرگِ ناگہاں نے اس کی مہلت نہ دی۔ پیامِ مشرق، اور ضربِ کلیم ان کی پاکستان میں موجودگی کے دوران طبع ہوگئی تھیں۔ باقی کتابیں مصر میں زیرِ طباعت تھیں۔ پھر معلوم نہیں ہوسکا کہ اُن کا کیا بنا۔ ضربِ کلیم میں تو پرویز صاحب کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ اِن کے علاوہ ڈاکٹر صاحب (مرحوم) نے "محمد اقبالؒ" کے نام سے حضرتِ علامہؒ کی سیرت، فلسفہ اور شاعری کے متعلق ایک مستقل تصنیف شائع فرمائی تھی۔

اگر کم از کم انہی کتابوں کی عام اشاعت ہوجائے تو عربی ممالک میں فکر اور پیغامِ اقبالؒ کے تعارف کے سلسلہ میں نہایت عمدہ پیش رفت ہوسکتی ہے۔

لیکن، جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، ایسا کرے گا کون؟

(۰)

۲- عصبیّتِ جاہلیہ

یہ تاریخ کی نہایت تحیر انگیز اور المناک حقیقت ہے کہ عربوں نے قرآنی انقلاب، کے عَلَم کو اِس قوت اور شدت سے بلند کیا کہ ساری دنیا محوِ حیرت رہ گئی۔ یہ انقلاب ان دساتیر و آئین و رسوم و رواج اور عادات و خصائل کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دینے والا تھا جو صدیوں سے عربوں کی نس نس میں رچے بسے چلے آرہے تھے۔ انہوں نے انہیں ایک ایک کرکے مسترد کیا اور ان کی جگہ اسلامی انقلاب کے اصول اور اقدار کو اس طرح اپنایا کہ وہ ان کی زندگی کے اجزا بن گئے۔ اس انقلاب کے بعد دنیا کا کوئی مؤرخ یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی عرب ہیں جو چند سال پیشتر تک انہی خطۂ زمین میں بستے تھے۔

لیکن جس قدر حیرت انگیز یہ انقلاب تھا اس سے کہیں زیادہ تعجب انگیز وہ تبدیلی تھی جو ان ہی عربوں میں چند سال کے بعد نمودار ہوئی۔ قرآنی انقلاب نے ملوکیت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ ملوکیت ہی نہیں، اس نے انسانوں پر انسانی حکومت کے تصور کو باطل قرار دے دیا تھا اور اس کی جگہ قانون کی حکومت کا انسانیت ساز تصور دیا، اور اس کے مطابق نظامِ حکومت قائم کیا جس میں قوانین بھی انسانوں کے وضع کردہ نہیں تھے۔ بلکہ خدا کے عطا فرمودہ، ابدی اور غیر متبدل تھے۔ لیکن چشمِ فلک یہ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں گم ہوکر رہ گئی کہ انہی عربوں نے اپنے ہاں ملوکیت کا نظام قائم کرلیا اور پھر اسے اس قدر مستحکم کیا کہ وہ ان کے ہاں آج تک متواتر چلا آرہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے عربوں کی اس تحیر انگیز تبدیلی کو دیکھ کر کہا تھا ؎

عرب خود را بہ نورِ مصطفےٰ سوخت چراغِ مردہ مشرق برافروخت !
ولیکن آں خلافت راہ گم کرد ! کہ اوّل مومناں را شاہی آموخت (ارمغانِ حجاز)

اِس کے بعد وہ خلافت اور ملوکیت میں امتیاز کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

خلافت بر مقامِ ما گواہی است حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است ! (ارمغانِ حجاز)

اور آخر میں ملوکیت کے متعلق قرآنِ کریم کا یہ قولِ فیصل پیش کیا ہے کہ ؎

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم !
کہ در دینش ملوکیت حرام است (ارمغانِ حجاز)

ملوکیت کے علمبرداروں میں، اُردن کے شاہ حسین بھی ہیں جن کا ذکرِ خیر ابھی آتا ہے۔

قرآن کا دوسرا انقلاب نسلی امتیاز اور تفوّق کا مٹا دینا تھا۔ عرب جاہلیہ میں یہ امتیاز اور تفوّق اس قدر شدید اور قوی تھا کہ جب اسلام نے اسے مٹا کر مساواتِ انسانیہ کی دعوت دی تو دنیا کا کوئی مؤرخ بھی اسے باور کرلینے پہ تیار نہیں تھا کہ عرب اس تبدیلی کو قبول کرلیں گے۔

لیکن جذبۂ ایمانی نے ان کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کی کہ انہوں نے نہ صرف نظری طور پر اس تبدیلی کو کو قبول کیا بلکہ عملاً ایک ایسی اُمّت کے افراد بن گئے جس میں خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کے تمام امتیازات ختم ہوگئے اور عربی اور عجمی سب مل کر بھائی بھائی بن گئے۔ اس میں بلالِ حبشیؓ اور عمر ابن خطاب میں کوئی فرق نہ رہا۔

لیکن چند ہی سال کے بعد وہ عہدِ جاہلیہ کا نسلی امتیاز پھر سے اُبھر آیا۔ حالانکہ حضورِ نبی کریمؐ نے اپنے آخری پیغام (خطبۂ حجۃ الوداع) میں اعلان فرمایا تھا:۔

یاد رکھو! جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر، اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، بجز تقویٰ کے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور اس طرح سب مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

نسلی تفریق کے احساس کو خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اس شدت سے مٹایا جاتا تھا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں فوج کے دو سپاہیوں میں کسی بات پر جھگڑا ہوگیا، تو ان میں سے ایک نے اپنے قبیلہ کا نام لے کر انہیں اپنی مدد کے لئے پکارا۔ اِس پر حضرت عمرؓ اس قدر برافروختہ ہوئے کہ آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کو ایک تفصیلی مراسلہ بھیجا جس میں لکھا کہ

اگر کبھی کوئی قبائلی تنازعہ اُبھرے اور کوئی شخص "یا آلِ فلاں!" کہہ کر آواز دے تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کی آواز ہے۔ ایسا کہنے والے کی تلوار سے خبر لو تاآنکہ وہ اللہ اور اپنے امام کی طرف

رجوع کرے۔ مجھے یہ اطلاع پہنچی ہے کہ قبیلہ، ضبّہ کے بعض افراد نے "یا آلِ ضبہ!" کہہ کر پکارا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میرا مراسلہ پہنچتے ہی انہیں سخت سزا دو تاکہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔ (شاہکارِ رسالت۔ صـ ۱۳۹)

اسلام نے یہ تعلیم دی تھی، لیکن انہی عربوں نے عربی نسل پرستی کے دستورِ جاہلیہ کو اس قدر اپنایا کہ وہ اُن کا جزوِ زندگی بن چکا ہے۔ ویسے تو ان کے ہاں عربی اور غیر عربی کا امتیاز صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن حال ہی میں ایک ایسا الم انگیز حادثہ سامنے آیا ہے جس نے ہمیں تڑپا کر رکھ دیا۔ گذشتہ دنوں اُردن کے دارالحکومت عمان میں عرب سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ

کسی عرب ملک اور غیر عرب ملک میں جنگ ہو گی تو کوئی بھی عرب ملک غیر عرب ملک کی حمایت نہیں کرے گا۔ (بحوالہ ہفت روزہ الاعتصام، لاہور۔ بابت ۵ دسمبر ۱۹۸۰ء)

اِنا لِلّٰہ و انا الیہ راجعون

یعنی یہ نہیں کہ حمایت اس ملک کی کی جائے جو حق پر ہو گا، اور اس ملک کی مخالفت کی جائے گی جو دھاندلی کرے گا۔ غیر عرب کیسا ہی برسرِ حق ہو، کوئی عرب ملک اس کی حمایت نہیں کرے گا۔ عربی اور غیر عربی کا یہ امتیاز زمانہ جاہلیت کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ حیرت ہے کہ عربی ممالک میں سے کسی نے بھی اس کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا! کیا آپ توقع کر سکتے ہیں کہ ان ممالک میں اسلام کبھی زندہ ہو سکے گا؟

(۰)

۳۔ عجمی نسل پرستی

ہم عربی نسل پرستی کا رونا رو رہے تھے، لیکن عجمی نسل پرستی اُس سے کچھ کم جگر سوز نہیں۔ یہ اس لئے کہ، جیسا کہ ہم بار بار لکھتے چلے آ رہے ہیں، دنیا بھر کے مسلمان یا وطنیت کی چار دیواری میں محصور ہیں، یا نسل پرستی کے دائروں میں محدود۔ یہ سب الگ الگ قومیں ہیں، اُمتِ واحدہ کہیں باقی نہیں۔ اور چونکہ امتِ واحدہ اور اسلام لازم و ملزوم ہیں، اس لئے اسلام اس وقت دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں۔ لیکن، اس کے باوجود، اسلام اور اسلامی تشخص کے الفاظ ہر ایک کی زبان پر ہیں۔ اس تضاد کی ایک نمایاں مثال بنگلہ دیش کے صدر، جنرل ضیاء الرحمٰن، کے اس انٹرویو سے ملتی ہے جو انہوں نے حال ہی میں مراکش کے ایک اخبار "الجمہوریہ" کو دیا ہے۔ اس میں انہوں نے کہا:۔

بنگلہ دیش اگرچہ اقتصادی طور پر ایک پس ماندہ ملک ہے، اور اس کے اردگرد مخالف قوتوں کا گھیرا بھی ہے، لیکن ہم اپنے مسلم تشخص سے دستبردار ہونے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہمارا ملک مسلمانوں کا ملک ہے اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ مسلمان، خواہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں ہمارے بھائی ہیں۔ اور اُن کے مسائل اور دُکھ سُکھ بھی ہمارے مسائل اور دُکھ سُکھ ہیں۔

(نوائے وقت ۲۹ نومبر ۱۹۸۰ء)

یہ الفاظ کس قدر خوش آئند اور جذبۂ ایمانی سے معمور نظر آتے ہیں، لیکن ان کے برعکس وہاں حالت کیا ہے، اس کے تصور سے روح لرز جاتی ہے۔ تقسیم ہند کے زمانے میں اقلیتی صوبوں کے مسلمان اپنا گھر بار، مال و دولت، کاروبار، جائیدادیں، سب کچھ چھوڑ چھاڑ پاکستان کی طرف آ گئے۔ مغربی پاکستان کے قریب تر علاقوں کے مہاجر مسلمان، مغربی پاکستان کی طرف، اور مشرقی پاکستان کے قریب کے علاقوں کے مہاجر مشرقی پاکستان کی طرف۔ ان میں اکثریت ان کی تھی جنہیں وہاں "بہاری" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ یہ وہاں بیس بائیس سال تک معزز اور پُرامن پاکستانیوں کی طرح رہے، لیکن جب سنہ ۱۹۷۱ء میں "مشرقی پاکستان" "بنگلہ دیش" میں تبدیل ہو گیا تو وہاں کے بنگالی مسلمانوں نے ان بہاری مسلمانوں کو ان کے گھروں، جائیدادوں، کاروبار اور ملازمتوں سے نکال باہر کیا۔ وہ دس برس سے وہاں کیمپوں میں پڑے سڑ رہے ہیں، اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ــــــ اس صدر کے زیرِ حکومت جس نے ابھی ابھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ "ہمارا یہ ایمان ہے کہ مسلمان، خواہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہوں، وہ ہمارے بھائی ہیں، اور ان کے مسائل اور دکھ سکھ بھی ہمارے مسائل اور دکھ سکھ ہیں"۔ ان کیمپوں میں مقیم "بہاریوں" کی تعداد اڑھائی تین لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ وہ سب کے سب پاکستان آنا چاہتے ہیں، لیکن (نوائے وقت کے الفاظ میں) "حکومت پاکستان کے ایک ترجمان کے مطابق اب ایسے افراد کی تعداد صرف سات آٹھ ہزار رہ گئی ہے جو بین المملکتی مفاہمت کے تحت پاکستان آنے کے مجاز ہیں، مگر سفر، متبادل آبادکاری وغیرہ کے سلسلے میں مالی مشکلات کے باعث انہیں پاکستان لانے کا معاملہ ملتوی ہوتا رہا ہے"۔ یعنی بنگلہ دیش کے بنگالی مسلمان اپنی نسل پرستی کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ وہ ان غیر بنگالی مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھیں اور ہم اہلِ پاکستان بین المملکتی مفاہمت کے ہاتھوں مجبور کہ ہم ان اڑھائی تین لاکھ مسلمانوں میں سے صرف سات آٹھ ہزار کو پاکستان آنے کے مجاز سمجھتے ہیں۔ اور دعویٰ ان کا اور ہمارا سب کا یہ ہے کہ "دنیا بھر کے مسلمان بھائی بھائی ہیں"۔ جب قوموں کے قول اور عمل میں تضاد ہو تو وہ تباہ ہو جایا کرتی ہیں۔

اس سلسلے میں نوائے وقت کی یہ دلیل بڑی وزنی اور ناقابلِ تردید ہے کہ

> جب پاکستان میں بارہ پندرہ لاکھ افغان مہاجرین پناہ لے سکتے ہیں اور ان کی تعداد میں ہر ماہ اضافہ ہو رہا ہے تو بنگلہ دیش میں محصور ان بہاریوں کے لئے کیوں گنجائش نہیں نکالی جا سکتی جو خود کو پاکستانی کہتے ہیں اور انہیں پاکستانی سمجھا بھی جاتا ہے۔
>
> (نوائے وقت ۲۹ نومبر سنہ ۱۹۸۰ء)

ــــــ (ن) ــــــ

۴۔ ہلاکو اور چنگیز سے کہیں آگے

تاریخ میں ہلاکو اور چنگیز کے (فرضی یا حقیقی) مظالم کی داستانیں ضرب المثل بن چکی ہیں۔ لیکن اب بھی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کے غبار میں وہ داستانیں گم ہو جاتی ہیں۔ بھارت کے شہر بھاگل پور

کا حال ہی کا واقعہ ہے۔ اکتیس ملزم جن کے مقدمات زیرِ سماعت تھے، پولیس کی حراست میں تھے۔ ایسے ملزموں کو پولیس کی زیرِ حراست اس لئے رکھا جاتا ہے کہ وہ محفوظ رہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کی پولیس نے اُن کے ساتھ کیا کیا؟ انہوں نے ان میں سے ایک ایک کی آنکھوں میں پہلے بائیسکلوں کی سلاخیں چبھو کر انہیں اندھا کر دیا اور اس کے بعد ان کی آنکھوں میں تیزاب ڈال کر انہیں جلا دیا، تاکہ اُن کا علاج بھی نہ ہو سکے ــــ کہا جائے گا کہ یہ اُن چند سپاہیوں کی انسانیت سوز قساوتِ قلبی تھی اور اس قسم کے درندہ صفت انسان ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن بات اس سے آگے بڑھتی ہے۔ وہاں کی حکومت نے اُن پندرہ سپاہیوں کو معطل کر دیا جنہوں نے اس لرزہ انگیز جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہاں کے شہری ان سپاہیوں کو سخت سزائیں دینے کا مطالبہ کرتے، انہوں نے ان کی حمایت میں مکمل ہڑتال کی۔ تعلیمی ادارے، دکانیں، بینک اور دفاتر مکمل طور پر بند رہے۔ ہڑتال کی اپیل وہاں کی پولیس کی تنظیم نے کی تھی۔ اور بعد ازاں دوسری انجمنوں نے بھی اس کی حمایت کر دی۔ عام لوگوں کی حمایت حاصل ہونے سے معطل شدہ پولیس افسروں کے حوصلے بلند ہو گئے اور حکومت کو دھمکی دی گئی کہ اگر ان کی معطلی کے احکام واپس نہ لئے گئے تو پولیس کے تمام بڑے بڑے افسر حکومت سے عدمِ تعاون پر مجبور ہو جائیں گے۔ (نوائے وقت بابت ۵ دسمبر ۱۹۸۰ء)

سوچئے کہ جو قوم خود اپنوں کے ساتھ یہ کچھ کرتی ہے، اگر کوئی غیر اُن کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اُس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کرے گی! تقسیمِ ہند کے زمانے میں جو کچھ انہوں نے نہتے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اور جو کچھ وہاں اب تک مسلمانوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے، اگر اس کی مستند تفصیل شائع کر دی جائے تو اس سے کم از کم اُن سطح بین پاکستانیوں کی آنکھیں کھل جائیں جو اٹھتے بیٹھتے یہ طعن دیتے رہتے ہیں کہ ہم نے ہندو سے الگ ہو کر کیا پایا!

(۰)

۵۔ اسلامی قوانین کا انسائیکلو پیڈیا

اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ متحدہ عرب امارات نے پندرھویں صدی ہجری کی تقاریب منانے کے لئے جس مجلسِ اعلیٰ کا تقرر کیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ بھی ہے کہ ایک ایسا انسائیکلو پیڈیا مرتب کیا جائے، جس میں تمام دنیا کے اسلامی قوانین کو یکجا کر دیا جائے۔ بالخصوص ان قوانین کو جو سلطنتِ عثمانیہ کے قیام سے لے کر اس وقت تک مرتب ہوئے ہیں۔ (دی مسلم۔ اسلام آباد۔ ۲ دسمبر ۱۹۸۰ء)

اس وقت مسلمانوں میں ایسے لٹریچر کی کمی نہیں جس میں قرونِ اُولیٰ سے لے کر بعد کے زمانے تک کے مختلف مذاہب کے فقہی قوانین درج ہیں۔ ان کی موجودگی میں اس قسم کا انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس قدر محنت اور کاوش سے جو کچھ حاصل ہوگا اس سے فائدہ کیا ہوگا؟ اگر ان فقہی قوانین کی حیثیت محض تاریخی ہو تو چنداں مضائقہ نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ ان قوانین کو قوانینِ خداوندی کی طرح ابدی اور غیر متبدل تصور کیا جاتا ہے۔ اور انہیں شریعتِ اسلامیہ

کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ تصور قرآن کے نظریۂ قانون سازی کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام کے نام پر اس قسم کی کوششیں اُمّت کی فکری اور اجتہادی صلاحیتوں کو مفلوج کئے جاتی ہیں، اور اسے ہزاروں سال پیچھے کی طرف لے جانے کا موجب بنتی ہیں۔ ہمیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مغربی قوتوں کی سازش کا نتیجہ ہے جو چاہتی نہیں کہ مسلمانوں میں غور و فکر کی صلاحیتیں بروئے کار آئیں۔ اُس کا مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ اِن کے دِلوں میں اِس خیال کو راسخ کر دیا جائے کہ اسلام کے متعلق جو کچھ سوچا جانا تھا وہ سوچا جا چکا ہے۔ اب اس میں مزید غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں۔ مغربی قوتیں اسلام کی حمایت کے نام سے جو کچھ کر رہی ہیں اور کرا رہی ہیں اُس سے مقصد یہی نظر آتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ابلیس کی زبان سے جو یہ کہلوایا تھا کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیمبرؐ کہیں

تو اس سے مغرب کی انہی سازشوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اور انہیں تاکید کی گئی تھی ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے

اس سے مراد صرف تصوّف کی منازل نہیں تھیں۔ امورِ شریعت میں جمود بھی تھا۔

یاد رکھیئے! جن لوگوں کے دل میں اسلام کے احیاء کا کوئی جذبہ ہے ان کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کریم کی ابدی حد بندیوں کے اندر رہتے ہوئے دورِ حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق از سرِ نو قوانین شریعت مرتب کریں۔ اس سے مسلمان اقوامِ عالم کے ہمدوش جادہ پیمائی کے قابل ہی نہیں ہو جائیں گے، بلکہ اُن کی امامت کے مستحق بھی ہو جائیں گے جو قرآن کی رو سے اِن کا صحیح مقام ہے۔ اور اِسی سے اقوامِ مغرب کی سازشیں ناکام بھی رہ جائیں گی۔

(۰)

۶۔ جشنِ آزادی

۱۶/۱۷ دسمبر کی درمیانی شب کو بی۔بی۔سی (لندن) نے اپنے براڈ کاسٹ میں ایک ایسی خبر کا اعلان کیا جو خون کے آنسو رُلا دینے والی تھی۔ اس میں کہا گیا کہ بنگلہ دیش آج ۱۶ دسمبر کو اپنی آزادی کا جشن بڑے جوش و خروش سے منا رہا ہے۔ حیرت ہوئی کہ یہ کونسی آزادی ہے جس کا اس طرح جشن منایا جا رہا ہے؟ اس حیرت کو اُس کے اگلے فقرے نے رفع کر دیا جس میں کہا گیا کہ وہاں کے اربابِ اقتدار نے کہا ہے کہ یہ وہ دن ہے جب بنگلہ دیش کی فوجوں نے پاکستان کی فوجوں کو شکست دے کر اپنی آزادی حاصل کی تھی — پاکستان، بنگالی اور غیر بنگالی مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں سے حاصل ہوا تھا اور یہ ایک ہی مملکت تھی، لیکن آپ غور فرمایئے کہ اس بیس بائیس سال کے عرصے تک مشرقی پاکستان کا بنگالی مسلمان، مغربی پاکستان کے متعلق کس قسم کے جذبات کو اپنے سینے میں دبائے بیٹھا تھا!

ہم نے اِس خبر کو بالخصوص، اس لئے شائع کیا ہے کہ ہم جو اس غلط فہمی میں مبتلا چلے آ رہے ہیں

کہ دنیا کے نوّے کروڑ مسلمانوں میں اِسلام کا رشتہ بنیادِ اخوّت ہے، جس قدر جلد اس غلط فہمی سے نکل جائیں اُتنا ہی اچھا ہے۔ اس وقت اسلام دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں، اور یہ نوّے کروڑ آبادی جو مسلمان کے نام سے موسوم ہے۔ اُن میں اِس لفظ کے سوا کوئی بھی قدرِ مشترک نہیں۔ ان کے ساتھ تعلقات اُستوار کرنے یا معاملات طے کرنے کے سلسلہ میں ہمیں اس ناقابلِ تردید حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ خود پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں میں اسلام وجہِ اشتراک نہیں تو نوّے کروڑ مسلمانوں میں یہ وجہِ اشتراک کس طرح ہو سکے گی؟ جب اسلام آئے گا تو وہ وجہِ اشتراک ہو سکے گا۔ اِس کے ساتھ ہی اس خبر کو بھی سامنے لے آیئے کہ دس ہزار پاکستانی مسلمانوں کو سعودی عرب سے نکالا جا رہا ہے کیونکہ وہ "غیر قانونی" طور پر وہاں رہ رہے ہیں۔ "اسلامی قانون" کی رُو سے پاکستانی مسلمان اور سعودی مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ وہ ایک ہی اُمّت کے افراد ہوں گے۔

(۰)

۷۔ فیڈرل شریعت کورٹ کا فیصلہ

اِسلام آباد سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامہ "دی مسلم" کی ۱۴ دسمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس عدالت نے اس درخواست کو مسترد کر دیا ہے جس میں اِستدعا کی گئی تھی کہ پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کے وجود کو غیر اسلامی قرار دیا جائے۔ خبر میں کہا گیا ہے کہ

> عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ اسلام کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی سیاست میں پارٹیاں موجود تھیں۔ عدالت نے اپنے فیصلے کی تائید میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسلام آباد کے ایک ریسرچ فیلو محمود احمد غازی کی یہ رائے نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے فوری بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زیرِ قیادت انصار دو متمیز گروہوں کی حیثیت سے سامنے آئے اور ثقیفہ بنی سعد میں جمع ہوئے۔

اس خبر میں رپورٹنگ کی غلطی واضح ہے۔ غازی صاحب نے کہا یہ ہوگا کہ انصار اور مہاجر دو سیاسی پارٹیاں تھیں۔ چونکہ یہ مسئلہ دین کے اساسی اصولوں میں سے ہے، اس لئے ہم عدالت کے فیصلہ کا انتظار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ انصار اور مہاجرین کو دو سیاسی پارٹیاں قرار دینا بنیادی غلطی ہے۔

(۰)

۸۔ اِسلام میں قانون سازی کا اُصول

ریٹائرڈ جسٹس کیکاؤس وغیرہ کی درخواست پر پاکستان کی سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ صادر فرمایا

ہے جو (P.L.D) کی اشاعت بابت اگست ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں بعض تبصرے، جن کا تعلق اسلام میں قانون سازی کے اصول سے ہے بڑے اہم ہیں۔ ہم انہیں اختصاراً (P.L.D) کے شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے:

(۱) اسلام تھیاکریسی نہیں جس میں مذہبی پیشوائیت کا تسلط ہوتا ہے۔ اس کے اصول نہ پوشیدہ ہیں نہ پیچیدہ، نہ الجھے ہوئے اور نہ ہی ناقابل عمل۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جس میں یہ صلاحیت اور قابلیت ہے کہ وہ ہر مقام اور ہر زمانے میں نافذ بھی کیا جا سکتا ہے اور اختیار بھی۔ شرط صرف یہ ہے کہ اُسے صحیح طریق پر اس کی روح کے مطابق سمجھا جائے اور اس کی تعبیر اُن حالات اور ماحول کو سامنے رکھ کر کی جائے جن میں اُسے نافذ کیا جانا مقصود ہے۔

(۲) اس میں ریٹائرڈ جسٹس محمد شفیع کے ایک فیصلے کا اقتباس بھی دیا گیا ہے، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم کا پڑھنا اور سمجھنا کسی ایک یا دو افراد کی اجارہ داری نہیں۔ اسے آسان اور قابل فہم زبان میں نازل کیا گیا تھا تاکہ جو مسلمان بھی کوشش کریں اُسے سمجھ سکیں اور اس پر عمل بھی کر سکیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے کا حق ہر مسلمان کو دیا گیا ہے، جسے کوئی شخص، خواہ وہ کتنے ہی بلند منصب پر فائز اور صاحبِ علم کیوں نہ ہو، اس سے چھین نہیں سکتا۔ قرآن کے سمجھنے کے لئے متقدمین کی تفسیروں سے صرف استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کی تعبیر میں انہیں حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے سے مراد اُس کی تعبیر ہے، اور تعبیر سے مقصود یہ ہے کہ اس کے احکام کو حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں اور دنیا کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کی روشنی میں نافذ کیا جائے۔ اگر اُن مفسرین کی تعبیرات کو جو بارہ تیرہ سو سال پہلے ہو گذرے ہیں، حرفِ آخر سمجھ لیا جائے تو تمام مسلم معاشرہ ایک فولادی پنجرے میں محبوس ہو جائے گا اور اسے اس کی اجازت ہی نہیں ہوگی کہ وہ زمانے کے ساتھ نشوونما پا سکے۔ اس سے اسلام ایک عالمگیر دینی نظام ہونے کے بجائے ایک ایسا مذہب بن کر رہ جائے گا جو اسی زمانے تک محدود رہے گا جس میں وہ نازل ہوا تھا۔

میں انتہائی انکسار کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ایسا قانون بنا دینا بالکل غلط ہوگا کہ اس ملک میں موجودہ عدالتوں کو اس کا اختیار نہیں ہوگا کہ وہ ائمہ سلف کی تعبیر کے خلاف کوئی تعبیر کر سکیں۔

(۳) مسٹر اے۔ کے۔ بروہی کی کتاب سے یہ اقتباس دیا گیا کہ

> قرآن ایک عالمگیر بنیادی قانون کی کتاب ہے۔ یہ اُمّتِ مسلمہ کو اس کا اختیار دیتا ہے کہ وہ اس کی روشنی میں ملت کے لئے ذیلی قوانین مرتب کرتے چلے جائیں۔ یہ بنیادی قانون بھی ہے اور مسلمانوں کے لئے ایک چارٹر بھی کہ وہ اس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے لئے خود قوانین مرتب کریں۔

اے کاش! اسلامی نظام اور قوانین شریعت کی بے مقصد بحثوں میں اُلجھنے والے ان حقائق کو اپنے لئے چراغِ راہ قرار دیں۔

رابطۂ باہمی

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشنیں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے بڑی محرک ثابت ہوا کرتی تھیں۔ لیکن ملک کی موجودہ فضا کے پیشِ نظر چند سالوں سے اُن کا انعقاد نہیں ہو سکا۔ بر سبیلِ تنزّل، اُن کی جگہ طلوع اسلام کی بزموں کے نمائندوں کے اجلاس وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کا ایک اجلاس ۱۱ دسمبر ۱۹۸۰ء کو ادارہ کے احاطہ میں منعقد ہوا۔ طلوع اسلام کی بزمیں بھی موجودہ دور میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے، نہ سیاسی پارٹیاں۔ یہ عملی سیاست میں حصہ ہی نہیں لیتیں، نہ اُمّت سے الگ اپنے لئے کوئی مذہبی طریق وضع کرتی ہیں۔ سیدھے سادے مخلص بندوں کی ایک جماعت — جس میں نہ کوئی سرمایہ دار ہے، نہ اربابِ مناصب و اقتدار۔ متوسط الحال اور اپنے ہاتھ سے محنت کرنے والوں کا ایک گروہ جو تیس (۳۰) سال سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اپنی بساط کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ اس دفعہ سوءِ اتفاق سے اجتماع سے چند روز پیشتر محترم پرویز صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس کی کارروائی میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ اجتماع درحقیقت تحریک کی مجالسِ مشاورت ہوتی ہیں، چونکہ کسی کے سامنے کوئی ذاتی مفاد نہیں ہوتا۔ اس لئے ان میں اخوت اور مودّت کا جو قرآنی نقشہ سامنے آتا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی۔ یہ اجتماع نہایت اہم فیصلوں کے ساتھ محترم پرویز صاحب کے جمعہ کے درس کے بعد بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ اجتماع کی اس کامیابی کے لئے ادارہ جملہ شرکاء کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

محترم پرویز صاحب کا

درسِ قرآن

بزم طلوع اسلام لندن (انگلینڈ) ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

149 SUTTON COURT RD

LONDON E-13 — 9NR.

PHONE 01 — 552—1517

لاہور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح

۲۵/بی، گلبرگ ۲، نزد پولیس سٹیشن

(فون نمبر 880800)

بزم طلوع اسلام ٹورنٹو (کینیڈا) ہر ماہ کے پہلے اتوار کو دس بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)

335 DRIFT WOOD AVE. #311 DOWNSVIEW

TORONTO (NORTH YORK) (ONT) M3N-2P3

PHONE [416] 661 — 2827

کراچی ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزم طلوع اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۲، بلاک ان چیمبرز، سلطان مینشن، ڈی ڈی میٹھا در کراچی نمبر ۲ — فون نمبر ۲۲۸۸۲۹

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزم طلوع اسلام۔ معرفت رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ۔ سول لائنز

عہدِ حاضر میں سنّتِ رسولؐ کی اہمیّت

اب سے کچھ عرصہ پہلے تک عام انداز یہ تھا کہ جب کوئی شخص (تقریر یا تحریر کے ذریعے) لوگوں کے سامنے آتا تو وہ اپنی علمی قابلیت کے ثبوت اور اپنی ثقاہت کی تصدیق کے لئے کوئی سند پیش کرتا۔ لیکن اب ایک نیا فیشن رائج ہو گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ تقریر کے لئے منبر یا سٹیج پر آئیں یا تحریر کے لئے قلم اٹھائیں تو آپ پہلے چند (چبھتے ہوئے) فقرے پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام کے خلاف کہہ دیجئے یا لکھ دیجئے۔ اس کے بعد آپ کو اپنی قابلیت، دیانت اور ثقاہت کے متعلق کسی ثبوت یا سند کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ جو جی میں آئے کہتے یا لکھتے چلے جائیں۔ سب مستند اور مصدقہ تسلیم کیا جائے گا۔ اس کی تازہ ترین مثال ہمارے سامنے ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے زیرِ نگرانی شائع ہونے والے ماہنامہ میثاق کی ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں، عنوانِ بالا کے تحت، ڈاکٹر الطاف جاوید صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ چونکہ موضوع "سنّتِ رسول اللہ کی اہمیت" ہے اس لئے طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب کا ذکر ان الفاظ میں سامنے آتا ہے۔

> اسی سلسلہ میں ادارہ طلوعِ اسلام کے بانی جناب غلام احمد پرویز کے بیان پر ستمبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں ماہنامہ فکر و نظر کے ایڈیٹر پروفیسر محمد سرور نے مفصّل تبصرہ کیا تھا اور بھرپور جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ (ص ۱۰۳)

کچھ نہیں بتایا گیا کہ پرویز صاحب کا بیان کیا تھا اور اس پر سرور صاحب کا تبصرہ کیا۔ نہ ہی اس کی ضرورت سمجھی گئی۔ کیونکہ مقصد تو وسوسہ اندازی تھا (یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ۔ قرآن مجید کی آخری سورۃ)۔ اور وہ اتنے ہی سے حاصل ہو گیا۔

ڈاکٹر الطاف جاوید صاحب نے اپنے مقالہ میں پہلے مولانا تقی امینی صاحب کا یہ قول نقل فرمایا ہے:۔

> دراصل قرآنِ حکیم نقشۂ تعمیر ہے اور سنّتِ رسولؐ اس نقشہ کے مطابق تیار کی ہوئی عمارت ہے۔ نقشہ یعنی کتاب کے ساتھ بجنسہٖ یعنی رسول کے بھیجنے کے اصول پر اس وقت سے برابر

عمل ہو رہا ہے[۱] جب سے ہدایاتِ الٰہی کے سلسلہ کی ابتدا ہوئی ہے۔ (ص۱۱)

اس تمہید کے بعد سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس "عمارت" کی پوزیشن کیا ہے؟ کیا وہ اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ابدی طور پر غیر متبدل رہے گی یا اس میں ردّ و بدل ہو سکے گا؟ اس سوال کے جواب کے لئے، محترم مقالہ نگار نے، مولانا تقی امینی کے اقتباسات بڑی تفصیل سے دیئے ہیں۔ ہم انہیں بعینہٖ درج ذیل کرتے ہیں:۔

"مقالہ نگار لکھتے ہیں۔ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مولانا موصوف نے کتاب اور نبیؐ کو نقشہ اور انجینئر سے تعبیر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں کہ

"البتہ حالات و مقتضیات کی رعایت ہر دور کی عمارت میں کی جاتی ہے، خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تیار کی ہوئی عمارت میں بھی اس کی رعایت موجود ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ عمارت کی اصل بنیاد اور ستون باقی رکھ کر اس رعایت سے جتنا فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں، اٹھائیں اور اپنے زمانے کے مناسب عمارت تعمیر کریں۔!!"

مولانا موصوف کے ایک مقالہ سے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تھیالوجیکل سوسائٹی کی طرف سے یونین ہال میں پڑھا گیا تھا۔ ماہنامہ فکر و نظر نے کچھ اقتباسات شائع کئے تھے، ان میں سے چند ایک یہاں پیش کئے جاتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:۔

"ہدایتِ الٰہی کسی معاشرے کو وجود میں نہیں لاتی ہے بلکہ انسان کے ہاتھوں معاشرہ وجود میں آتا ہے، جس میں خیر و شر دونوں کی نمود اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ظہور ہوتا ہے!" — پھر فرمایا کہ — "ہدایتِ الٰہی اپنے نزول کے زمانے میں اس وقت کے معاشرے کو محض خیر و شر کی نسبت سے بطورِ نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں سے دستبردار ہو کر زندگی کی گاڑی کو اسی معاشرے پر چلاتا رہے اور ترقی یافتہ عمارت کے مقابلے میں ہمیشہ اسی عمارت کی طرف دعوت دیتا رہے۔ مقصود عمارت نہیں ہوتی بلکہ خیر و شر کی وہ نسبت اور عدل و اعتدال کی وہ قوت ہوتی ہے جو ہدایتِ الٰہی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے اور بطورِ نمونہ اسی کو پیش کرتی ہے!"

پھر فرمایا کہ — "معاشرہ فطری افتاد کے مطابق ترقی کرتا اور بدلتا رہے گا۔ اس کو نہ کسی کا جمود روک سکتا ہے اور نہ کسی قوم کا زوال بریک لگا سکتا ہے۔ اب اگر کسی کو جمود توڑنا اور زوال کو ختم کرنا ہے تو ذہنی اور فکری تبدیلی کے ساتھ اس کے اپنے زمانہ کی تنظیمی، ترقیاتی چیزوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے!" — !!

پھر فرمایا کہ — "جدید معاشرہ کی رہنمائی کے لئے بنیادی نقطۂ نگاہ یہ بنانا پڑے گا کہ اگر اس وقت ہدایت کے نزول کا زمانہ ہوتا اور محسنِ کائنات خود بنفسِ نفیس تشریف فرما ہوتے تو آپ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا کس قدر لحاظ فرماتے اور معاشرتی فلاح و بہبود کی چیزوں میں کس جذبہ کو ملحوظ رکھتے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے معاشرے کو "ہدایت" کے سانچے میں ڈھالنے

---

[۱] "ہو رہا تھا" لکھنا چاہیئے تھا۔ (طلوعِ اسلام)

کے لئے 'ازالہ' (REPLACEMENT) کی بجائے 'اضافہ' (ADDITION) کی جو روش اختیار فرمائی ہے اور ترمیم و تنسیخ نیز تدریج و تخفیف کے جن اصول و ضوابط سے کام لیا ہے وہ سب جدید معاشرہ کی رہنمائی کے لئے دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں!"

مولانا موصوف نے اپنی ایک اہم تصنیف: "احکامِ شرعیہ میں زمانہ اور حالات کی رعایت" — میں تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب سے چند اہم باتیں پیش کی جاتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ — "مسلم قوم کے زوال نے ایک نئے دور کو جنم دیا ہے۔ اس نئے دور کے نظریات نے ایمان و اعتقاد کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور معاشرہ کی تشکیل نے مذہب و زندگی کے ہر شعبہ میں بے شمار نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ پہلے تجدیدِ دین کی بات ایک معاشرہ تک محدود تھی۔ اب اس کا تعلق ایک 'دور' سے مل گیا ہے!" — پھر فرماتے ہیں — "پچھلا دور اپنی سابقہ شکل میں پھر واپس نہیں آتا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق کوئی دور اس طرح ختم نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اپنی شکل میں واپس آئے اور کوئی دنیا اس لئے نہیں لٹتی ہے کہ وہ اپنی سابقہ حالت پر پھر آباد کی جائے ..... اس بناء پر یہ توقع فضول ہے کہ سابق دور واپس آئے گا اور اس کے معاشرہ میں ملکی و معاشرتی قانون عملی حالہ نافذ ہوں گے۔ اب نئی دنیا کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں ہے!"

پھر فرمایا کہ — "مذہب کی نمائندگی جس انداز سے ہو رہی ہے اس میں بڑی حد تک فکر و عمل کی وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو دورِ زوال کی یادگار ہیں اور جن کو زمانی تبدیلیوں نے پامال بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس امر پر سب کو اتفاق ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ لیکن ان شعبوں کی تفسیر و تعبیر میں اب تک جاگیرانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے —!"

پھر فرمایا کہ — "یہ کام جرأت و ہمت اور کھلے دماغ کے ساتھ براہِ راست غور و فکر کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا۔ لیکن مذہب کے نام پر مختلف برادریاں اور گروہی تعلقات کی جکڑ بندیاں کچھ اس طرح گرفت میں لئے ہوئے ہیں کہ ان سے صرفِ نظر کر کے جرأت و ہمت کے مظاہرے کی توقع بے سود ہے اور ان کو ساتھ لے کر کھلے دماغ کے ساتھ کسی فیصلے کی امید بے کار ہے!"

پھر فرمایا کہ — "اندازِ فکر بدلنے کی ضرورت ہے۔ مذہب اب تک قدیم تنظیم کو سمجھا جا رہا ہے، چونکہ اس کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس بناء پر مذہب کے نام پر چند مراسمِ عبادت سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ خواہ اس کا نام حفاظتِ دین رکھا جائے یا طبیعت خوش کرنے کے لئے اقامتِ دین کا نام دے دیا جائے، نتیجہ ایک ہے، نہ قرونِ وسطیٰ کا دور واپس آئے گا اور نہ زمانہ ہماری خاطر رجعتِ قہقہری اختیار کرے گا۔"

مزید فرمایا کہ — "دنیا اپنی تنظیمات میں رجعتِ قہقہری نہ اختیار کرے گی اور زمانہ ہماری خاطر قدیم شکلوں کو قبول نہ کرے گا۔ اگر زندہ رہنا ہے تو لامحالہ احکام کے موقع و محل کی تعیین کر کے اسلام کی روح اور تعلیمات کو جدید تنظیمات میں بھرنا ہوگا" —!!

پھر فرمایا کہ ——" موجودہ دور میں مسلم ممالک طبقاتی کش مکش کی جس منزل پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر مذہبی پلیٹ فارم سے انفرادی ملکیت کی آڑ میں سرمایہ داری و جاگیرداری نظام کی تبلیغ و تائید کی جاتی رہی تو لازمی طور پر وہ اشتراکیت کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے۔"

اس عالی پایہ کتاب سے آخری اقتباس دے کر بحث کو ختم کرتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "مسلم معاشرہ ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں قدم رکھ چکا ہے اور آشیانہ بنانے کے لئے تنکوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ سرگردانی اس لئے کہ دوسری دنیا کے آشیانے اس طائرِ لاہوتی کے جسم و روح پر فِٹ نہیں آرہے ہیں اور اس کا اپنا آشیانہ جس دور میں تھا وہ دور ختم ہو چکا ہے۔ اس میں جس دنیا کے تنکے تھے وہ دنیا لٹ چکی ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق کوئی دور اس طرح ختم نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اپنی شکل میں واپس آئے اور کوئی دنیا اس طرح نہیں لٹتی کہ وہ اپنی سابقہ حالت پر پھر آباد کی جائے۔ یہ عالم کون و فساد ہے۔ یہاں بگاڑ کے ساتھ بناؤ، اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہے۔ خود فطرت ہر گوشہ میں کانٹ چھانٹ کرتی اور خوب سے خوب تر شئے کو فِٹ کرتی ہے۔ جب کوئی شئے ایک جگہ فِٹ ہو جاتی ہے تو کمتر شئے کے لئے وہ جگہ نہ چھوڑے گی بلکہ قبضہ کے لئے اس سے بلند تر اور برتر شئے کا ہونا ضروری ہے!"

ہم ماہنامہ میثاق اور اس کی وساطت سے ڈاکٹر الطاف جاوید صاحب کی اطلاع کے لئے عرض کرتے ہیں کہ پرویز صاحب کا بعینہٖ یہی مسلک ہے۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ (پرویز صاحب کے نزدیک) اس عمارت میں ردّ و بدل کا اختیار کسی فرد، یا گروہ یا فرقہ کو نہیں ہوگا (ایسا صرف خلافت علیٰ منہاجِ رسالت۔ یعنی اسلامی مملکت ہی کر سکے گی)۔ اب جو فتویٰ آپ پرویز صاحب کے خلاف صادر فرمائیں گے ظاہر ہے کہ وہ آپ کے ممدوح، مولانا تقی امین صاحب پر خود بخود چسپاں ہو جائے گا۔ اتنا اور بھی عرض خدمت ہے کہ، آپ کو معلوم نہیں مولانا محترم کے خیالات سے کب متعارف ہوئے ہیں، طلوعِ اسلام میں ان کے افکار، آج سے سولہ سال پہلے (اشاعت بابت اگست۔ ستمبر ۱۹۶۴ء میں) شائع ہوئے تھے —— اب فرمائیے کیا ارشاد ہے؟

زنجیہ۔ درسِ قرآن

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان۔ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ (فون [illegible])	**گجرات** میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/۱ بی جمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)
مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خاں۔ نواب علی روڈ	**جلال پور جٹاں** میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)
راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) [illegible] ۱۹۷/ [illegible]	**ملتان** میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز حسین آگاہی گیٹ۔ (فون ۳۱۰۷۱)

باسمہ تعالیٰ

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی!

سُنئے!

قرآن کی آواز کہاں سے اُٹھ رہی ہے؟

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا!

باسمہٖ تعالیٰ

سُنیئے! قرآن کی آواز ——— کہاں سے اُٹھ رہی ہے؟

اِن میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دِل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں!

جب ۱۹۵۵ء میں، پرویز صاحب کی انقلاب آفریں کتاب ——— نظامِ ربوبیت ——— شائع ہوئی تو قدامت پرست طبقہ کی طرف سے، اُس کے خلاف طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ طوفانِ مخالفت مبنی بر وجہ تھا، نہ خلافِ توقع۔ ہمارا مروّجہ (مذہب) اسلام، جس کا علمبردار ہمارا قدامت پرست طبقہ ہے، ہمارے عہدِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے، اور چونکہ ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری لازم و ملزوم ہوتے ہیں، اِس لئے یہ نظام (سرمایہ داری) عین مطابقِ اسلام قرار پا جاتا ہے۔ پرویز صاحب کا پیش کردہ، قرآن کا معاشی نظام، نظامِ سرمایہ داری کو جڑ بنیاد سے اُکھیڑ دیتا تھا' اِس لئے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اِس کی مخالفت قابلِ فہم تھی۔ پرویز صاحب کے پیش کردہ نظام کی بنیادیں، قرآن مجید کے ابدی اور غیر متبدل اصولوں پر استوار تھیں، اِس لئے وہ مخالفت کی اِن تلاطم خیزیوں کے سامنے چٹان کی طرح، بخود و خزیدہ و محکم کھڑے رہے۔ ان کی اِس کوہ آسا اِستقامت کا نتیجہ تھا کہ مخالفت و معاندت کی یہ شدّت کم ہوتی گئی اور قرآنی نظام کے تصوّر کی ضیا باریاں وسیع سے وسیع تر۔ اُن کے اِس استقلال کے ساتھ خدا کی کائناتی قوتیں بھی شریک تھیں، جنہیں (اصطلاحِ عام میں) زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ اب اِس کی شہادت محسوس شکل میں نمایاں ہو رہی ہے، اور یہی اِن سطور کی تحریر کا جذبۂ محرکہ ہے۔ لیکن قبل اِس کے کہ ہم اِس شہادت کو سامنے لائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کے پیش کردہ قرآنی نظامِ معیشت کے نمایاں خط و خال کو سامنے لایا جائے، تاکہ اِس تقابل سے حقیقت زیادہ واضح ہو جائے۔ (اِس میں حوالے، نظامِ ربوبیت کے ۱۹۷۸ء کے ایڈیشن کے ہیں)۔

(۰)

پرویز صاحب کا پیش کردہ نظامِ معیشت

۱- ہر ذی حیات کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری، اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لے رکھی ہے ـــــ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶ ۔ صفحہ ۲۹۵)

۲- رزق میں انسان کی صرف طبیعی پرورش شامل نہیں، اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما بھی شامل ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ زکوٰۃ وہ جامع اصطلاح ہے جس میں انسانی جسم اور اس کی صلاحیتوں، سب کی نشوونما شامل ہوتی ہے۔ (صفحہ ۴۱۵)

۳- اللہ تعالیٰ، رزق مہیا کرنے کی اپنی ذمہ داری براہِ راست پوری نہیں کیا کرتا۔ یہ اس نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے جسے جماعتِ مومنین اس کی راہ نمائی کے مطابق قائم کرتی ہے۔ اسے اسلامی مملکت یا اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔ (۲۲/۴۰ ۔ صفحہ ۴۱۷)

۴- اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وسائلِ رزق اُس مملکت کی تحویل میں رہیں۔ وسائلِ رزق میں بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے، اس لئے زمین پر انفرادی ملکیت تو ایک طرف، خود مملکت کی ملکیت بھی جائز نہیں۔ مملکت اس کا نظم ونسق اس طریق پر کرے گی جس سے تمام افرادِ معاشرہ کو رزق حاصل ہوتا رہے۔ (صفحات ۱۲۶ - ۱۲۵)

۵- جب زمین پر انفرادی حقِ ملکیت نہ رہا، تو اس پر جائدادیں کھڑی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

۶- اگلا سوال محنت کے معاوضے کا ہے، اور (ظاہر ہے کہ) اقتصادیات میں یہ سوال بڑا بنیادی بھی ہے اور بیشتر اُلجھنیں پیدا کرنے کا موجب بھی۔ اس لئے قرآن مجید نے اسے بڑی وضاحت سے حل کیا ہے۔ اُس نے سب سے پہلا اصول تو یہ بتایا: لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (۵۳/۳۹) "معاوضہ صرف محنت کا ہوگا" اور اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ (۵۳/۳۸) "کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا" (صفحہ ۱۲۷)۔ اس اصول نے نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد تک کو اُکھیڑ کر رکھ دیا۔ معاوضہ محنت کا ہوگا، سرمایہ کا نہیں۔ محنت ہر ایک کو خود کرنی ہوگی۔ یہ نہیں کہ کوئی اپنے سرمائے کے بل بوتے پر، خود محنت کئے بغیر، دوسروں کی محنت کا استحصال کرے۔ (ضمناً) "محنت کا معاوضہ" دورِ سرمایہ داری کی وضع کردہ اصطلاح ہے۔ اس کی رُو سے سرمایہ دار محنت کش طبقہ کی محنت کا "معاوضہ" متعین کرتا ہے۔ یہیں سے سلب ونہب ـــــ (EXPLOITATION) ـــــ کا سارا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے "مَا سَعٰى" کہا ہے۔ یعنی محنت کا ماحصل۔ بالفاظِ دیگر، ہر محنت کرنے والا اپنی محنت کے ماحصل کا مستحق ہوتا ہے۔

لیکن اس اصول کی رُو سے اِن اُلجھنوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے جو نظامِ سرمایہ داری کا خاصا ہیں یعنی جس کسی کی محنت کا ماحصل اس کی ضروریات سے زیادہ ہوگا اس کے پاس فالتو دولت جمع

ہو جائے گی۔ اور فالتو دولت (SURPLUS MONEY) نظامِ سرمایہ داری کی اصل اور بنیاد ہے۔ اور جس کی محنت کا ماحصل اس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ناکافی ہوگا، وہ مفلس اور محتاج ہوگا۔ اس سے معاشرہ میں امیروں اور غریبوں کے دو مستقل طبقات پیدا ہو جائیں گے۔ ان طبقات کا وجود فسادِ آدمیت کی جڑ ہے۔

۷۔ اس فتنہ کے استیصال کے لئے قرآن کریم نے "عدل و احسان" کا اصول متعین فرمایا۔ (۱۶/۹۰) عدل سے مراد یہ ہے کہ کسی کے پاس اُس کی ضرورت سے زائد نہ رہے۔ اور احسان کے معنی یہ ہیں کہ جس کی محنت کا ماحصل اس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ناکافی ہو (یا محنت کرنے سے معذور ہو) اس کی اس کمی کو پورا کر دیا جائے۔ (مطالب الفرقان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۹۱) قرآن کریم کے معاشی نظام کی بنیاد، عدل اور احسان پر ہے۔

۸۔ عدل کے سلسلہ میں فرمایا: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (۲/۲۱۹) "اے رسول! یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کس قدر دے دیں۔ (فرمایا کہ ان سے کہو) کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب" — (صفحہ ۱۵۸) دوسری طرف احسان کے ضمن میں کہا کہ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (۵۱/۱۹ ؛ ۷۰/۲۴-۲۵) "ان کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا حق ہے"۔ سائل وہ جس کی محنت کا ماحصل اس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ناکافی ہو، محروم وہ جو کسی وجہ سے محنت کرنے سے معذور ہو۔ ان کے متعلق کہا کہ، جن کے پاس ان کی ضروریات سے زائد ہے، اُن کے مال و دولت میں ان لوگوں کا حق ہے۔ یعنی یہ اُن کو کچھ بطورِ خیرات نہیں لیں گے۔ اپنے حق کے طور پر (AS OF RIGHT) لیں گے۔ "عدل و احسان" کے اس اصول کی رُو سے، غریبوں اور امیروں کے طبقات باقی ہی نہ رہیں گے۔ اس طرح وہ معاشرہ قائم ہو جائے گا جس میں حقیقی مساواتِ انسانیہ اور احترامِ آدمیت جلوہ بار ہوگی۔ اس نظام کی عملی شکل یہ ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ (۹/۱۱۱) یعنی "مومن اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں، اور خدا انہیں جنت عطا کر دیتا ہے"۔ عملاً یہ سودا افراد اور نظامِ اسلامی کے مابین ہوتا ہے۔ فرد اپنی محنت کا ماحصل اس نظام کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ نظام، جملہ افرادِ معاشرہ کو 'سامانِ رزق' اس معیار کے مطابق مہیا کرتا ہے جو جنت کے ضمن میں قرآن میں مذکور ہے۔ (صفحہ ۱۵۷) جنت کی نعماء تمام اہلِ جنت کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوتی ہیں۔ اس میں امیروں اور غریبوں کے طبقات کا تصور تک نہیں ہوتا۔

۹۔ اور یہاں سے وہ بنیادی سوال سامنے آتا ہے جو ہر اقتصادی نظام کی اساس اور بنیاد ہوتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ ایک شخص جان مار کر محنت کرتا ہے۔ وہ اپنی محنت کے پورے کے پورے ماحصل کا

مالک ہوتا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرے کہ اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے لئے رکھ لے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے؟ اصل سوال جذبۂ محرکہ کا ہے جس کے تحت وہ ایسا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

کمیونزم کہتی ہے کہ سٹیٹ اس سے یہ مال و دولت زبردستی چھین لے گی۔ لیکن یہ سلسلہ قائم کیسے رہ سکتا ہے؟ وہ شخص آئندہ اتنی ہی محنت کرے گا جو اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ اس سے زیادہ محنت کرے گا ہی کیوں؟ ڈنڈے کے زور سے مملکت ایسا کرا ہی نہیں سکتی۔ اور کمیونزم میں اس کے سوا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہوتا جس سے افرادِ معاشرہ سے بھرپور محنت کرائی جائے۔ یہ وجہ تھی جو کمیونزم کا نظام قائم رہ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ وہ قائم نہیں رہا۔ بُری طرح ناکام ہوا۔ پرویز صاحب کی کتاب "نظامِ ربوبیت" میں ایک باب کا عنوان ہے ــــ "جہاں مارکس ناکام رہ گیا۔ اس سے آگے" ــــ اس سے آگے وہ جذبۂ محرکہ ہے جو قرآنی نظام کی اساس قرار پاتا ہے اور جو کبھی ناکام نہیں رہ سکتا۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ انسان کی ایک زندگی تو اس کے جسم کی (طبیعی) زندگی ہے۔ اس میں حیوان اور انسان سب مشترک ہیں۔ لیکن انسان کو ایک اور شے بھی عطا کی گئی ہے، جسے اس کی ذات یا نفس (SELF) کہا جاتا ہے۔ اسے یہ ذات غیر نشوونما یافتہ شکل میں دی جاتی ہے، اور اس کی نشوونما کرنا انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ مومن اس مقصود و منتہیٰ کو اپنا ایمان قرار دیتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کی محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کو بطیبِ خاطر سرانجام دیتا ہے۔ اصولِ حیات یہ ہے کہ

انسان کی طبیعی زندگی ہر اُس چیز سے پرورش پاتی ہے جسے وہ اپنے استعمال کے لئے لیتا ہے۔ اُس کی ذات کی نشوونما ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا ہے۔

يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ (۹۲/۱۸) "مومن اپنا مال دوسروں کی ضروریات کے لئے دیتا ہے تاکہ اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہو جائے"۔ وہ جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ دوسروں کو دینے کے قابل ہوگا۔ اور جتنا زیادہ دوسروں کو دے گا اتنی ہی زیادہ اس کی ذات کی نشوونما ہوگی۔

یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جس کی بنیاد پر قرآن کے معاشی نظام کی اس قدر عظیم عمارت قائم ہوتی ہے۔ وہ اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ بطیبِ خاطر دوسروں کے لئے دیئے چلا جاتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دے سکے، اور اس طرح اپنی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما کر سکے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے اس قدر "حریص" ہوتا ہے کہ اپنا زائد از ضرورت مال ہی دوسروں کے لئے نہیں دیتا، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے: يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) "وہ خود تنگی و ترشی میں گذارہ کر لیتا ہے اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے"۔

یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جو قرآن کے معاشی نظام کی اساس محکم ہے۔ کمیونزم (مارکسزم یا سوشلزم) جو خدا اور انسانی ذات کی منکر ہے، اسے یہ اساس کس طرح میسر آسکتی تھی؟ یہ وجہ ہے پرویز صاحب اس حقیقت کو بار بار دہراتے چلے آئے ہیں کہ "نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی مسلمان کمیونسٹ"۔ یہ فرق کفر اور ایمان کا ہے۔

۱۰۔ پرویز صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ربوٰ، سود کی کسی خاص شکل کا نام نہیں۔ یہ دراصل نظامِ سرمایہ داری کے لئے قرآنی اصطلاح ہے۔ اُس نے جب کہا تھا کہ اگر ربوٰ سے باز نہ آؤ گے، تو اسے خدا اور رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھو، تو اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ قرآنی نظامِ معیشت اور نظامِ سرمایہ داری (ربوٰ) ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام لانے کے بعد، نظامِ سرمایہ داری (ربوٰ) باقی رکھنا، اسلامی نظام کے خلاف بغاوت ہے۔ ربوٰ (یا نظامِ سرمایہ داری) سے مراد، سرمایہ پر بڑھوتری ہے خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ اس لئے ہر قسم کا سود، مضاربت (کاروبار میں روپیہ لگا کر منافع لینا) یا مزارعت (زمین بٹائی یا پٹہ پر دینا) سب ربوٰ ہی کی مختلف شکلیں ہیں اور اسلامی نظام کے خلاف بغاوت کے مترادف۔

۱۱۔ "نظامِ ربوبیت" میں ایک باب زکوٰۃ کے لئے بھی مخصوص کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا موجودہ مفہوم یہ ہے کہ جتنا جی چاہے روپیہ جمع کر لو اور سال کے بعد اس میں سے تھوڑے سے پیسے "فی سبیل اللہ" دے دو۔ ظاہر ہے کہ ایسا کچھ نظامِ سرمایہ داری ہی میں ممکن ہے۔ قرآنی نظام میں جب کسی کے پاس زائد از ضرورت رہتا ہی نہیں تو مال جمع کرنے اور اس پر زکوٰۃ ادا کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوگا؟ زکوٰۃ کا یہ مفہوم درحقیقت نظامِ سرمایہ داری کو (بزعمِ خویش) "مسلمان کرنے" (ISLAMISATION) کی سعیٔ ناکام تھی۔

۱۲۔ پرویز صاحب نے بتایا ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں اپنے نظام کی آخری اور مکمل شکل بتائی ہے وہیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ مروجہ نظامِ سرمایہ داری سے قرآنی نظام تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ اور اس عبوری دور کو رفتہ رفتہ طے کیا جائے گا۔ قرآنِ کریم میں صدقہ، خیرات، محتاجوں، غریبوں کی امداد سے متعلق تاکید۔ وصیت اور وراثت سے متعلق احکام، سب اسی دور سے متعلق ہیں۔ قرآن کے معاشی نظام کی تکمیل پر یہ احکامات نافذ العمل نہیں رہیں گے۔ اس نظام میں وہ تقاضے خود بخود پورے ہوتے جائیں گے جن کے لئے عبوری دور میں ان کی ضرورت تھی۔

یہ ہیں اُس قرآنی نظامِ معیشت کے نمایاں خط و خال جسے پرویز صاحب نے "نظامِ ربوبیت" میں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اب آیئے اُس "شہادت" کی طرف جس سے ہم نے اس مقالہ کا آغاز کیا ہے۔ یعنی یہ کہ زمانے کے تقاضے کس طرح ہمارے اربابِ دانش و اقتدار کی سوچ کا رُخ قرآنی نظام کی طرف موڑ رہے ہیں۔ یہ داستان بصیرت افروز بھی ہے اور شرحِ صدر کا موجب بھی۔

(۱)

باب دوم

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا .....

اپریل ۱۹۸۰ء میں مرکزی حکومتِ پاکستان کی وزارتِ مالیات نے اِس مقصد کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ حکومت کی راہ نمائی کے لئے اسلامی اصلاحات کا ایجنڈا مرتب کرے۔ اِسے (COMMITTEE ON ISLAMISATION) سے تعبیر کیا گیا۔

یہ کمیٹی حسبِ ذیل حضرات پر مشتمل تھی:-

۱- پروفیسر سید نواب حیدر نقوی۔ ڈائرکٹر، پاکستان انسٹی ٹیوٹ اوف ڈویلپمنٹ اکنامکس، اسلام آباد۔

۲- مسٹر ایچ۔ یو۔ بیگ، سیکرٹری منسٹری اوف فنانس۔ اسلام آباد۔

۳- پروفیسر رفیق احمد۔ پرو وائس چانسلر۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور۔

۴- پروفیسر میاں ایم۔ نذیر۔ پروفیسر اوف اکنامکس۔ پشاور یونیورسٹی، پشاور

اِس کمیٹی نے اپنی رپورٹ مئی ۱۹۸۰ء میں پیش کر دی تھی، لیکن جہاں تک ہمارے علم میں ہے، یہ پبلک کے سامنے اس وقت آئی جب اسے اسلام آباد سے شائع ہونے والے روزنامہ "دی مسلم" نے اپنی اشاعات بابت (۶-۷-۱۱-۱۲ نومبر ۱۹۸۰ء) میں بالاقساط شائع کیا۔ اِس کے بعد اسی روزنامہ کی ۲۷ نومبر کی اشاعت میں اس پر تفصیلی تبصرہ بھی شائع ہوا۔ آئندہ صفحات میں ہم اس رپورٹ پر اپنی گذارشات پیش کریں گے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ مصلحتیں (یا مجبوریاں) کیا تھیں جن کی بنا پر یہ رپورٹ اس قدر تاخیر کے ساتھ منظرِ عام پر آئی حالانکہ یہ اس قدر اہم اور معلومات افزا تھی کہ نہ صرف یہ کہ اسے بلا تاخیر پبلک کے سامنے آنا چاہیئے تھا بلکہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہیئے تھی۔ اس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ہم اس تبصرہ کا پمفلٹ بھی شائع کرنا چاہتے ہیں اور اپنی وسعت کے مطابق وسیع پیمانے پر اس کی

ط کچھ دنوں سے ہمارے ہاں "اسلامائی زیشن" کی اصطلاح عام طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ اِس کا عام ترجمہ "مسلمان کرنا" ہو سکتا ہے، لیکن یہ الفاظ اس اصطلاح کا صحیح مفہوم ادا نہیں کر سکتے۔ کسی غیر اسلامی نظریہ، نظام یا سسٹم کو "مسلمان کرنا" بے معنی ہے۔ غیر اسلامی نظریات وغیرہ کو اسلامی نظریات سے بدلا تو جا سکتا ہے۔ انہیں "مسلمان" نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح (NATIONALISATION) کا عام ترجمہ "قومیانہ" کیا جاتا ہے، (ISLAMISATION) کا ترجمہ شاید "اسلامیانہ" کیا جائے۔

اشاعت بھی۔

(۰)

ہم نے اِس رپورٹ کا مطالعہ، مسرت اور تعجب کے ملے جُلے جذبات سے کیا۔ مسرت اِس بات سے کہ رپورٹ فی الجملہ قرآنِ مجید کے ارشادات پر مبنی ہے، اور تعجب اِس پر کہ (جہاں تک ہماری معلومات ہماری راہ نمائی کرتی ہیں) یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایوانِ حکومت سے قرآنِ کریم کی آواز اِس انداز سے بلند ہوئی ہے، اور وہ بھی اقتصادیات (اکنامکس) کے سلسلہ میں ——— وہ اکنامکس جس کے متعلق عام تأثر یہ ہے کہ یہ عصرِ حاضر کی ان اوّلیات میں سے ہے جن کا مذہب سے تعلق نہیں۔ ایک ایسے مسئلہ کا مطالعہ اور تجزیہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے کرنا، اور پھر اِس کا حل قرآنِ کریم کی راہ نمائی میں پیش کرنا، باعثِ مسرت اور درخورِ تہنیت ہے۔ ہم اس پر اس کمیٹی کے چیئرمین اور ارکان کی خدمت میں دِلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

اب آیئے رپورٹ کی طرف جس کے متعلقہ حصص کا رواں ترجمہ پیش کیا جائے گا۔

(ضمناً) اِس میں آیاتِ قرآنی کا صرف (انگریزی) ترجمہ دیا گیا ہے۔ متن نہیں دیا گیا۔ یہ آیات اس مقالہ کے باب اوّل میں "نظامِ ربوبیت" کے حوالوں سے درج کی جا چکی ہیں۔ اس لئے انہیں دوبارہ درج کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جو آیت وہاں نہیں آئی، اسے البتہ درج کر دیا جائے گا——— رپورٹ کی مختلف شقوں کا مطالعہ کرتے وقت، "نظامِ ربوبیت" کی متعلقہ شقوں کو سامنے رکھنا مفید ہوگا۔

(۰)

رپورٹ کا "مطلعِ انوار" ہے:-

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳/۱۸۰)

ارض و سمٰوات اللہ کی ملکیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے معاشی نظام کی یہی اساس اور بنیاد ہے۔ اِس کے بعد جو کچھ کہا جائے، وہ اسی نقطہ کی تفسیر ہوگا۔ کس قدر حسین اور درخشندہ ہے یہ آغاز!

(۰)

(۱) اسلامی نظامِ معیشت کا مقصود و منتہیٰ قرآنِ کریم کی اِس آیۂ جلیلہ کی روشنی میں بتایا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

کرۂ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ (پ ۱۲)

(رپورٹ ص ۵)

(ضمناً) رپورٹ میں طباعت کی غلطی سے اِس آیت کا حوالہ (پ ۹) دیا گیا ہے۔ صحیح حوالہ (پ ۱۲) ہے۔ رپورٹ

میں اِس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ خدا کی یہ ذمہ داری اسلامی نظامِ حکومت کی طرف سے پوری ہوتی ہے۔ (صفحہ ۱۶)

(۲) دوسرے مقام پر اس اجمال کی تفصیل اِن الفاظ میں دی گئی ہے:-

اسلامی نظامِ معیشت کی امتیازی خصوصیت، پرائیویٹ پراپرٹی (ذاتی املاک) کے متعلق اس کے نقطۂ نگاہ میں مضمر ہے۔ اِس خصوصیت کی رُو سے، دولت۔۔ تمام کی تمام خدا کی ملکیت ہوتی ہے اور انسان اِس کا امین ہوتا ہے نہ کہ مالک۔ یہ اسلام کی منفرد خصوصیت ہے۔ ایک طرف یہ نظام سرمایہ داری سے یکسر متمیز ہے جس میں ذاتی ملکیت کو مقدس قرار دیا جاتا ہے، اور اس کا بہرحال تحفظ ضروری ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف سوشلزم سے متمیز جس میں دولت کو مملکت کی ملکیت ٹھہرایا جاتا ہے۔ (صفحہ ۳)

اِس بنا پر کہا گیا ہے کہ

معاشی نظام کے اسلامیانے کے پروگرام میں سب سے اہم اور بنیادی سوال ذاتی ملکیت کی انسٹی ٹیوشن کو "مسلمان کرنا" ہے۔ اس انسٹی ٹیوشن کی بنیاد نظامِ جاگیرداری اور سرمایہ داری پر ہے۔ اِس سلسلہ میں زمین کی انفرادی ملکیت کا سوال سب سے اہم ہے۔ یہ نہ صرف ناہمواریوں کا سرچشمہ ہے، بلکہ معاشرتی فسادات اور اخلاقی انحطاط کا موجب بھی ہے۔ اِس لئے ضرورت اِس امر کی ہے کہ اس کی اصلاح اس طرح کی جائے کہ یہ "ملکیت" کے دائرے سے نکل کر "امانت" کے احاطہ میں آجائے۔ (صفحہ ۱۳)

(۳) رپورٹ کی تمام تجاویز یا سفارشات جس محور کے گرد گردش کرتی ہیں، وہ ہے "عدل اور احسان"۔ رپورٹ کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس پر کسی نہ کسی بحث کے ضمن میں یہ آیتِ قرآنی: (اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ) نہ آئی ہو۔ اِس میں "عدل" کے مفہوم کو زیادہ وسعت دی گئی ہے۔ یعنی ہر شعبہ میں توازن ـــــ پیداوار، صَرف، اور تقسیم کے تعلقات کا عدل و توازن کی بنیادوں پر استوار کرنا۔ اور احسان کا مفہوم یہ۔۔ کہ جو شخص اقتصادی بدحالی کا شکار ہو جائے، اسے اس پستی سے نکالا جائے۔ (صفحہ IV)

(ضمناً) رپورٹ میں احسان کو ہر جگہ (AHSAN) لکھا گیا ہے۔ یہ غالباً طباعت کی غلطی ہے صحیح تلفظ (IHSAN) ہے۔ (۱۶/۹۰)

"عدل اور احسان" کے قرآنی اصول کو عمل میں لانے کے سلسلہ میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دولت کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ وہ اُوپر کے طبقہ ہی میں گردش نہ کرتی رہے: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (۵۹/۷)۔ (رپورٹ صفحہ IV)

اس کا مقصد یہ ہے کہ دولت کی از سرِ نو تقسیم اس انداز سے کی جائے کہ "عدل و احسان" کا تقاضا پورا ہو۔ بنائے خداوندی پر کسی ایک طبقہ کی اجارہ داری یکسر خلافِ اسلام ہے۔ (صفحہ IV)

احسان کا تقاضا پورا کرنے کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱/۱۹)۔ دولت مندوں کی دولت میں ان لوگوں کا حق ہے جو معاشی طور پر خود کفیل نہ ہوں۔ (صفحہ ۱۷)۔ اس ارشادِ خداوندی کی تعمیل کے لئے تمام دولت کی، از سرِ نو تقسیم ضروری ہو گی۔ (صفحہ ۷)۔

(۴) دولت کی اِس تقسیم کا اصول انفاق ہے۔ یعنی

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۗ (۲/۲۱۹)

(اے رسول!) تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر (دوسروں کی ضروریات کے لئے) دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، وہ سب۔

رپورٹ میں اِس بنیادی نقطہ پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ (صفحہ ۲۰)

(۵) دولت کا اِس طرح تقسیم نو کا نتیجہ یہ ہو گا کہ معاشرہ میں امیر اور غریب کے طبقات ختم ہو جائیں گے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے:-

> اِس میں شبہ نہیں کہ آغازِ کار کے وقت غریب اور امیر کے طبقات دوش بدوش موجود ہونگے، لیکن قرآنی اصولوں کے مطابق دولت کی از سرِ نو تقسیم کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اولاً اِن کے درمیان موجودہ خلیج رفتہ رفتہ کم ہوتی جائے گی، اور آخر الامر ان طبقات کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ دولت کی تقسیم نو اس لئے بھی اہم ہے کہ ہم اس وقت غیر اسلامی معاشی نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں دولت کی غلط تقسیم کی وجہ سے شدید ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں۔ زمین کی ذاتی ملکیت اِس کا بہت بڑا سبب ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت کی طرف جانے کے لئے قدم اوّل یہ ہونا چاہیئے کہ شہری اور دیہاتی دولت کی تقسیم عدل و احسان کی بنا پر کی جائے۔ اِس کے لئے فیصلہ کن اقدامات کی ضرورت ہو گی۔ یہ سمجھنا کہ معاشرہ میں وسیع پیمانے پر دولت کو از سرِ نو تقسیم کرنے کے سلسلہ میں کچھ نہیں کیا سکتا، یہ اسی طرح چند خاندانوں میں مفبوض رہے گی اور وراثتاً آگے منتقل ہوتی جائے گی، بالفاظِ دیگر یہ کہنا ہے کہ دولت کی موجودہ ناہموار تقسیم اسلام کے تقاضے کے مطابق ہے۔ یہ بڑا باطل (ABSURD) تصوّر ہے۔ (صفحہ ۴)۔

(۶) رپورٹ میں اِس حقیقت کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ انسانی مساوات سے مراد محض "روٹی" کی مساویانہ (یا حسبِ ضرورت) تقسیم نہیں۔ اس سے مراد اُن تمام مواقع اور سہولتوں کا مساویانہ مہیا کرنا ہے جن سے انسانی صلاحیتوں کی نمود اور نشوونما ہوتی ہے۔ رپورٹ میں ہے:-

> عدل سے مراد، اُن مواقع کا مساویانہ مہیا کرنا ہے جن سے انسان کی داخلی صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں۔ (صفحہ ۸) اس کے لئے عالمگیر اور مفت تعلیم لابدی ہے۔

ربوٰ اور زکوٰۃ

(۷) آجکل یہ غلط فہمی عام ہے کہ ربوٰ، سود کو کہتے ہیں، اور اگر سود ختم کر دیا جائے تو سارا اقتصادی نظام اسلامی ہو جائے گا۔ رپورٹ میں اِس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے

بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ تمہید میں کہا گیا ہے:۔

نظامِ سرمایہ داری کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنا اور یہ سمجھنا کہ سود کو ختم کر دینے سے تمام مسائل حل ہو جائیں گے اور ہم اطمینان اور مسرت کی زندگی بسر کریں گے، شیخ چلی کی سی باتیں ہیں۔ یہ کمیٹی اِس قسم کے مشورہ کو بالکلیہ مسترد کرتی ہے۔ کمیٹی کا نظریہ یہ ہے کہ اسلام جب ربوٰ کو ختم کرتا ہے تو وہ درحقیقت پورے کے پورے نظامِ سرمایہ داری کو ختم کرتا ہے۔

(صفحہ X)

دوسرے مقام پر اِس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے اور ربوٰ کے ساتھ (مروّجہ) زکوٰۃ کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ کمیٹی کی یہ بحث بڑی غور طلب ہے۔ لکھا ہے:۔

آجکل جس پروگرام کو اسلام کے اقتصادی نظام کے بلند دعاوی کے ساتھ عام کیا جا رہا ہے، وہ عوامی سطح پر زکوٰۃ کی ترویج اور سود کے خاتمہ سے متعلق نہایت مُبہم اور غیر واضح خیالات کی نشر و اشاعت سے زیادہ کچھ نہیں۔ تأثر یہ دیا جا رہا ہے کہ اسلامی اقتصادیات بس ان دو عناصر کا نام ہے۔ (اِن دو مقاصد کو حاصل کر لیا تو اسلامی اقتصادیات کا مسئلہ حل ہو گیا)۔ اس قسم کا دعویٰ غلط اور باطل ہے، اس لئے کہ کسی اقتصادی نظام، بالخصوص اسلام کے اقتصادی نظام کو اِس قسم کی دو ایک اجناس میں سمٹایا نہیں جا سکتا۔ علاوہ ازیں اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہو تو، پھر بھی یہ اشد ضروری ہے کہ اسلامی نظام کے ان اہم عناصر کا صحیح مفہوم سمجھا جائے۔ اِس حقیقت کو بڑی آسانی سے واضح کیا جا سکتا ہے کہ اسلام جب ربوٰ کو مسترد کرتا ہے، تو وہ درحقیقت پورے کے پورے سرمایہ دارانہ نظام کو مسترد کرتا ہے۔ وہ نظام جس کی بنیاد ہی غریبوں کی محنت کے استحصال پر قائم ہے۔ جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے، وہ اسلام کے بلند ترین مساویانہ اقتصادی فلسفہ کی ایک علامت ہے[1]۔ اب یہ کہنا کہ سود مٹ گیا تو نظامِ سرمایہ داری مٹ جائے گا۔ اور اگر امیروں سے ۲½ فیصد کے حساب سے زکوٰۃ وصول کر لی تو اس سے غریبوں کی احتیاج اور افلاس کا مسئلہ حل ہو جائے گا، اور امیروں اور غریبوں کے درمیان حائل خلیج پٹ جائے گی۔ دورِ حاضرہ میں اُن معاشی مسائل کی اہمیت اور نوعیت کا صحیح اندازہ لگانے کے متعلق اپنی جہالت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اتنا ہی نہیں، اس میں ایک خطرہ اور بھی ہے۔ اگر معاشی نظام کے اسلامیانے کے آغازِ کار کے سلسلہ میں، زکوٰۃ کی ترویج اور سود کے استیصال پر جس مبالغہ آمیز انداز سے زور دیا جا رہا ہے اور اس پروگرام کی تکمیل کے لئے دو تین سال کی مدت مقرر کی جا رہی ہے۔ تو اِس کا

---

[1] ایسی دقیق اور بلند حقیقت کو کیسے دلآویز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ درحقیقت اسلام کے اقتصادی نظامِ مساوات کی علامت ہے جس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اس نظام کا مقصد، نوعِ انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ضروری اقدامات بروئے کار لانا ہے۔

نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشی اصلاحات کے متعلق پالیسی وضع کرنے میں انہی دو عناصر پر توجہ مرکوز رہے گی، اور باقی تمام عناصر نظر انداز ہو جائیں گے۔ کوشش یہ کی جائے گی کہ کسی نہ کسی طرح ان دو اہداف (TARGETS) کو حاصل کر لیا جائے، خواہ ملک کی اقتصادیات پر اس کا کچھ ہی اثر کیوں نہ ہو۔ اور جونہی یہ دو مقاصد حاصل ہو گئے، ہر ایک اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو جائے گا کہ سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ صورتِ حال بڑی خطرناک ہوگی۔ ذرا غور کیجئے کہ دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں، جہاں زکوٰۃ کو مملکت کے تمام ٹیکسوں کی حیثیت سے نافذ کیا گیا ہے اور سود کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے باوجود وہاں انتہائی معاشرتی ناانصافیاں عام ہیں، اور عدل و احسان کے تقاضوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں سرمایہ کی کمی ہو اور افلاس کی زیادتی، جہاں اقتصادی استحصال عام ہو، اس قسم کی ناہمواریاں پیدا کرنے کا رجحان اور بھی زیادہ ہوگا۔ ربوٰ کی جگہ "منافع میں شراکت" کا طریق امیروں کے ہاتھوں غریبوں کے استحصال کے نئے دروازے کھول دے گا۔ اور ۲½ فی صد زکوٰۃ اقتصادی ناانصافیوں کو دور کرنے کے لئے قطعاً ناکافی ہوگی۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ جو اصلاحات اسلام کے نام سے نافذ کی جائیں، جب وہ اقتصادی استحصال کو دور کرنے میں ناکام رہ جائیں، اور یہ ناکامی خود ان اصلاحات کی پیدا کردہ ہو، تو اس کے بعد اصلاحِ احوال کی صورت کیا ہوگی؟ اس سے حالت بدسے بدتر ہو جائے گی۔ ذرائع اور مقاصد کو کبھی باہمد گر مخلوط نہیں کرنا چاہیئے۔ (صفحہ ۱۱-۱۰)

دوسرے مقام پر ربوٰ اور "منافع میں شراکت" کے سوال پر بحث کرتے ہوئے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ کمیٹی بڑی شدت سے محسوس کرتی ہے کہ آجکل ربوٰ کے متعلق جس انداز سے بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے، وہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ اس مسئلہ کی پیچیدہ نوعیت کو پوری طرح سمجھا ہی نہیں جا رہا۔ اولاً، یہ سمجھنا مبالغہ ہوگا کہ سود کی مروجہ مثبت شرح ہی اقتصادی ظلم اور استحصال کی وجہ ہے۔ اس کے برعکس، موجودہ نظامِ سرمایہ داری میں، اقتصادی استحصال کا اہم ترین سرچشمہ منافع ہے۔ بنابریں، جہاں یہ ضروری ہے کہ بتدریج ہی سہی، ربوٰ کے ختم کرنے کے طریقے سوچے جائیں۔ کوئی ایسی تجویز جو ربوٰ کو منافع کی شراکت میں تبدیل کر دے، اسلامی نظامِ معیشت کی طرف قطعاً قدمِ اوّل نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس نظام کا مدار عدل و احسان پر ہے، اور منافع کا تصور اس اصول کی نفی کرتا ہے۔ (صفحہ ۲۰)

(مختصراً) جب تک موجودہ نظامِ سرمایہ داری قائم ہے، ربوٰ کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو نظامِ سرمایہ داری کے ختم ہونے سے ہی ختم ہو سکتا ہے۔ نہ ہی ربوٰ کا نام "منافع" رکھنے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ربوٰ ختم ہو گیا۔ اس قسم کی تجاویز کو یکسر مسترد کر دینا چاہیئے۔ (صفحہ ۲۷)

(۸) رپورٹ میں اس حقیقت کی وضاحت کی بھی گئی ہے کہ اسلامی نظام، موجودہ نظام میں پیوند سازی سے قائم

نہیں ہو سکے گا۔ اِسے تو موجودہ نظام کی جگہ بالکلیہ نافذ کیا جائے گا۔ (صفحہ ۱۲) لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ، اسلامی نظام کو اس کی مکمل شکل میں قائم کرنے تک کا راستہ بتدریج طے کیا جائے گا۔ اِس سے نظر بظاہر یوں دکھائی دے گا گویا، معاشرہ کو اسلامیا لنے کا پروگرام بڑا سست رفتار ہے۔ لیکن ایسا کرنا ناگزیر ہے۔ موجودہ ہمہ تن داغدار معاشرہ کو "عدل و احسان" کی منزل تک قدم بقدم ہی پہنچایا جا سکے گا۔ (صفحہ ۱۰)۔ اس عبوری دور میں، انتہائی اقدامات کے بجائے، بر سبیل تنزل اختیار کردہ اقدامات کو قبول کرنا لازمی ہو گا۔ دیکھنا صرف یہ ہو گا کہ ہمارا ہر قدم اُس نصب العین کی طرف اُٹھ رہا ہے یا نہیں؟

ایک اشکال

(۹) رپورٹ کے مطالعہ سے نظر آتا ہے کہ "عدل و احسان" کے اصول کے مطابق زمین اور مال کی از سرِ نو تقسیم کے راستے میں کمیٹی کو، اسلام کا قانونِ وراثت، سب سے بڑی رکاوٹ دکھائی دیتا ہے۔ (صفحہ ۱۴)، بالخصوص زمین کے معاملہ میں۔ اس مشکل کے حل کے لئے انہوں نے مختلف اصلاحی اقدامات تجویز کئے ہیں۔ لیکن وہ اِن سے کلی طور پر مطمئن نظر نہیں آتے۔

ہمیں حیرت ہے کہ جن حضرات نے قرآن کے معاشی نظام کو اس قدر واضح طور پر سمجھ لیا، قانونِ وراثت کا سوال ان کے لئے کس طرح لاینحل ہو گیا؟ جب انہوں نے اس حقیقت کو پا لیا کہ قرآن کی رُو سے زمین پر ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی، تو اس کے لئے وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ قانونِ وراثت تو عبوری دور کا قانون ہے۔ اس دور کے لئے تدریجی اقدامات عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔ اسلامی نظام کی آخری شکل میں، نہ زمین پر کسی کی انفرادی ملکیت رہے گی، نہ وراثت کا سوال پیدا ہو گا۔

باقی رہا مال و دولت پر قانونِ وراثت کے اطلاق کا سوال، تو وراثت کا قانون، ما ترک پہ نافذ ہوتا ہے۔ یعنی جو کچھ کوئی چھوڑ کر مرے، اس کی تقسیم قانونِ وصیت اور وراثت کی رُو سے ہوتی ہے۔ جب اِسلام کے معاشی نظام میں، زائد از ضرورت مال و دولت کسی کے پاس رہے گا ہی نہیں، تو قانونِ وراثت کس دولت پر منطبق ہو گا؟

اِن کے متعلق صرف عبوری دور کے لئے اصلاحات کی ضرورت ہو گی۔

(۱۰) زمین کی مجوزہ اصلاحات کے سلسلہ میں، کمیٹی کی ایک سفارش البتہ تعجب انگیز اور ناقابلِ فہم ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ پٹہ (کاشت پر دی جانے والی زمین کا مقررہ کرایہ) تو ربٰو ہے۔ لیکن زمین کو بٹائی پر دے دینا، ربٰو نہیں۔ جائز ہے۔ (صفحہ ۱۴) ربٰو سے مراد ہے محض سرمایہ پر بڑھوتری۔ مزارعت میں، زمین کے مالک کا اصل (یعنی زمین) محفوظ رہتا ہے اور اس پر اُسے منافع ملتا ہے۔ یہ منافع، سرمایہ پر بڑھوتری ہے، لہٰذا ربٰو، خواہ وہ پٹہ کی شکل میں ہو اور خواہ بٹائی کی شکل میں۔ یہ تو عجیب سی شکل ہو گی کہ سرمایہ پر بڑھوتری نقدی کی شکل میں ہو تو حرام، اور اگر جنس کی شکل میں ہو تو جائز! ایسا کچھ تو فقہ کے باب الحیل میں ہوتا ہے!! ——— جب کمیٹی کی تحقیق کی رُو سے، کاروبار (مضاربت) میں منافع کی شراکت ربٰو ہے تو منافع میں اسی قسم کی شراکت مزارعت میں بھی ہوتی ہے۔ اِس لئے اس باب میں مضاربت اور مزارعت

میں کچھ فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی نظام میں دونوں ناجائز ہوں گے۔

بہرحال، یہ دو ایک نکات تھے جن کی وضاحت ضروری تھی۔ اِس کے بعد رپورٹ کے سلسلہ میں آگے بڑھیئے:-

(۱۱) کمیٹی کو اس کا بھی احساس تھا کہ جو تجاویز اُس نے پیش کی ہیں اُن پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ تو سوشلزم یا کمیونزم ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا ہے:-

آپ جو معاشی نظام بھی وضع اور اختیار کریں گے اِس کے کچھ گوشے ضرور ایسے ہوں گے جو دیگر معاشی نظاموں کے بعض گوشوں سے ملتے جلتے ہوں گے۔ (اور ایسا ہی اسلامی نظام میں بھی ہوگا) اس قسم کی جزوی مماثلت کسی نظام کو اس کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیت سے محروم نہیں کر دیتی۔ ایک چیز ہوتی ہے کسی نظام کی اصل و اساس اور مقصود و منتہیٰ، اور دوسری چیز ہوتی ہے۔ وہ طُرق اور ذرائع جن سے وہ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ نظام ان دونوں کے امتزاج سے متشکل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی نظام، دیگر نظام ہائے عالم سے، جن میں سوشلزم اور کمیونزم بھی شامل ہے، مُنفرد بھی ہے اور اسے اوّلیت کا شرف بھی حاصل ہے۔ (صفحات ۱۲ - ۱۱ ز ۲۷)

یہ منفرد اور ممتاز اسلامی نظام کیا ہے؟ اس سوال کا مکمل جواب اس وقت ہی دیا جا سکتا ہے جب عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی وہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہو کر سامنے آجائے۔ (صفحہ ۲۷)

اُس وقت تک ہمیں اِس نظام کی آخری منزل کی طرف نہایت استقامت کے ساتھ رواں دواں رہنا چاہیئے، اور اس سے اِفلاس، اِحتیاج اور معاشی استحصال کے مسائل کا جو حل پیش کیا ہے، سب سے پہلے انہیں اپنی گرفت میں لینا چاہیئے۔ (صفحہ ۲۷)

(۱۲) اِس کے ساتھ ہی رپورٹ میں اس امتیازی خصوصیت کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے جو اسلامی نظام کو دیگر نظامہائے عالم سے منفرد بنا دیتی ہے۔ تحریر ہے:-

اسلام کا معاشی نظام، کوئی الگ تھلگ نظام نہیں۔ یہ درحقیقت اس کے پورے نظامِ زندگی کا ایک جزو، بلکہ اس کے اندر سمویا ہوا ہے۔ اس نظام کا اصل الاصول "لینے" کے بجائے "دینا" ہے۔ اس سے انسان کی مادی اور رُوحانی[1] دونوں زندگیاں سنور جاتی ہیں..... قرآن کا یہ پیغام (کہ حقیقی کامیابی کا راز دینے میں ہے) اس قدر انسانیت ساز ہونے کے باوجود ایسا انقلاب انگیز ہے کہ اِس سے قلبِ انسانی کی گہرائیوں میں خوابیدہ جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔

---

[1] انگریزی زبان کی یہ محدودیت ہے کہ اس میں مادہ کے مقابلہ میں (SPIRIT) کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ لامحالہ روحانی کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد انسانی ذات کی نشوونما ہے نہ کہ خالقانیت کی روحانیت۔

جب انسان دیکھتا ہے کہ اس نظام میں آسے، غیر اسلامی نظامہائے عالم کے مقابلہ میں کس قدر فراواں اور زیادہ حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کے قیام اور استحکام کے لئے بطیبِ خاطر آمادہ اور بروئے عمل ہو جاتا ہے۔ موجودہ غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے پروگرام میں کامیابی اسی طریق سے ہو سکے گی۔ یعنی عوام کے قلبی تعاون سے۔ یہ انقلاب، محض معاشی انقلاب نہیں ہوگا۔ یہ موجودہ غیر اسلامی معاشرہ کو اسلامی معاشرہ میں تبدیل کرنے کا ذریعہ ہوگا۔ (یوں اسلامی نظام ہماری پوری کی پوری زندگی کو محیط ہو جائے گا۔ (صفحہ ۱۱/۱۲)

دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

اسلام اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان کو اگر علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ بڑا خود غرض اور بخیل ہوتا ہے۔ (۱۷/۱۰۰) اس کے برعکس منشائے خداوندی یہ ہے کہ کرۂ ارض پر ہر ذی حیات کو سامانِ رزق مہیا ہو۔ (۱۱/۶) اس سے ظاہر ہے کہ بھوک اور افلاس۔ منشائے ایزدی نہیں۔ انسانوں کے خود ساختہ نظاموں کی پیدا کردہ لعنتیں ہیں۔ اسلامی نظام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے افرادِ معاشرہ کے دل میں "لینے" کے بجائے "دینے" کے جذبات بیدار رہیں، اور اس طرح معاشرہ خدا کی صفتِ ربوبیت کا آئینہ دار ہو جائے۔ تاکہ ہر فرد کو سامانِ زیست مہیا ہوتا رہے۔ پاکستان جیسے معاشرہ میں، جو نظام سرمایہ داری کی بنیادوں پر استوار ہے، اسلامی نظام کے قیام کے لئے فضا ہموار کرنے کے لئے مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ——— روٹی، صحت، تعلیم، سکونت وغیرہ ——— مہیا کرنے کی ذمہ داری کو پورا کرے۔ (صفحہ ۵)

———(ہ)———

یہ ہیں اس کمیٹی کی تجاویز یا سفارشات جسے حکومت نے اقتصادی اصلاحات کے لئے مقرر کیا تھا آپ ان تجاویز پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان میں قرآنِ کریم کا معاشی نظام کس طرح جھلمل جھلمل کر رہا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

"ہم انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی اپنی آیات نمایاں کرتے چلے جائیں گے تاآنکہ یہ بات سب پر واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعوےٰ مبنی برحقیقت ہے۔"

جب روس نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھائی تھی، تو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار!

انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرفِ قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک
اِس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار! (ضربِ کلیم صـ ۱۳۸)

اس کے ساتھ ہی انہوں نے روس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مارکسزم کے ہاں وہ اساسِ محکم نہیں جس پر معاشی نظام کی اس قدر عظیم عمارت اُستوار ہو سکے۔ وہ اساس خدا کی کتاب میں ملے گی۔ روس (اور اس کے بعد چین) نے اس اساس کو نہ اپنایا اور اُن کا نظام ناکام رہ گیا۔ لیکن زمانے کے تقاضے بدستور آگے بڑھ رہے ہیں اور یہ نظر آ رہا ہے کہ قرآن کے معاشی نظام کے لئے فضائے عالم ہموار ہو رہی ہے۔ اور زیرِ نظر رپورٹ اس کی درخشاں شہادت ہے۔

اِس کمیٹی نے قرآن کے معاشی نظام کی آخری منزل اور اس تک پہنچنے کے راستہ کی نشاندہی کرنے کا فریضہ بطریقِ احسن ادا کر دیا ہے جس کے لئے وہ مستحقِ مبارک باد ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان نشاناتِ راہ کا اتباع کرتے ہوئے کاروانِ ملّت کو اُس منزل تک لے جانے کی سعادت کس کے حصّے میں آتی ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے پروگرام کا آغاز اقتصادی انقلاب سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھوک اور خوف، کو عذاب سے تعبیر کیا ہے۔ (۱۶/۱۱۲)۔ سو، جو قوم عذاب میں مبتلا ہو اُس میں اسلامی نظام کے قیام کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کا آغاز ہی ربوبیت کے تذکرہ سے ہوتا ہے، اور خدا کی یہی صفت، اُس کے نظام کا نقطۂ آغاز ہے —— اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۔

نوٹ: —— رپورٹ کا نام ہے:

AN AGENDA FOR ISLAMIC ECONOMIC REFORM.

شائع کردہ:

PAKISTAN INSTITUTE OF DEVELOPMENT ECONOMICS,
ISLAMABAD.

نظامِ ربوبیت

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اِس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ: (یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں اور یہ کیوں ناکام ہو گئے ہیں اور ان کے برعکس (۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسانی کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے —— اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

✱ کتاب آفسٹ کی چھپائی اور اعلیٰ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے —— ضخامت تقریباً چار سو صفحات —— سنہری جلد —— قیمت فی جلد پچاس روپے محصول ڈاک

باسمہ تعالیٰ

مطالبۂ پاکستان کی اساس

دو قومی نظریّہ

جس کے خلاف شر انگیز اعتراضات کئے جاتے ہیں

پرویز

دو قومی نظریہ

(اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی نگاہوں میں)

ذیل کا مقالہ، روزنامہ نوائے وقت کی ۲۱ نومبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اسے پرویز صاحب کی نظرِ ثانی کے بعد، نوائے وقت کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے:۔

(۰)

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کے نوائے وقت میں میرا مبسوط مقالہ شائع ہوا، جس کا عنوان تھا ــــ "کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے" ــــ اس میں ضمناً دو قومی نظریہ کا بھی ذکر آ گیا تھا، لیکن چونکہ میرے زیرِ نظر موضوع دوسرا تھا اس لئے میں اُسے چھوتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اُس مقالہ کی اشاعت کے بعد مجھے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ جس طرح میں نے اسلامک سٹیٹ اور سیکولر سٹیٹ کے فرق کو نکھار اور ابھار کر بیان کیا ہے اور اس باب میں قائدِ اعظمؒ کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح "دو قومی نظریہ" کے متعلق بھی مجھے تفصیل سے لکھنا چاہیئے اور اس باب میں علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے نظریات اور مسلک کو وضاحت سے بیان کرنا چاہیئے۔ یہ سطور اسی مطالبہ کی تعمیل میں تحریر ہیں۔

جب اس کرۂ ارض پر انسانوں نے پہلے پہل مل جل کر رہنا شروع کیا تو وہ (مختصر ہی سہی) لامحالہ ایک جماعت، ایک گروہ، ایک معاشرہ تھا جس میں کسی قسم کی تفریق اور تقسیم نہیں تھی۔ اس کے بعد ان میں تفریق پیدا ہونی شروع ہوئی۔ قرآن کریم کے الفاظ میں:۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ط (۱۰/۱۹)

ابتدا میں نوعِ انسان ایک ہی اُمت تھی۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔

ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں کو پھر سے امتِ واحدہ بنانے کے لئے انبیاء کرامؑ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ارشاد ہے:۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط (۲/۲۱۳)

"نوعِ انسان شروع میں ایک ہی اُمت کے افراد تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع

ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مبشرین اور منذرین انبیاء کرامؑ کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے ساتھ ضابطہ، قوانین بھی نازل کیا تاکہ وہ اس کے ذریعہ ان کے اختلافات کو مٹا کر (انہیں پھر سے اُمّتِ واحدہ بنا دیں)۔

نوعِ انسان کی اُمّتِ واحدہ، سب سے پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی۔ خاندان بڑھے تو اس تفریق نے قبائل کی شکل اختیار کی۔ قبائل دامن دراز ہوئے تو نسلی امتیازات کی تفریق پیدا ہو گئی۔ اور اب اس دور میں اس تقسیم نے قومیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس تفریق کے لئے کرۂ ارض پر لکیریں کھینچی گئیں اور ان سے مختلف ممالک وجود میں آ گئے۔ اور ایک ملک کی چار دیواری کے اندر رہنے والے انسان ایک قوم کے افراد قرار پا گئے۔ اس طرح خدا کی وسیع و عریض زمین مختلف ملکوں کی حدود میں بٹ گئی اور انسانوں کی عالمگیر برادری نے متعدد قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ اب کوئی انسان محض انسان ہونے کی نسبت سے پہچانا نہیں جاتا۔ وہ متعارف ہوتا ہے وطن یا قوم کی نسبت سے۔ اس سے دنیا کس قدر عالمگیر جہنم کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس کا اندازہ اس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جو دنیا (بالخصوص مغرب کے دانشوروں) سے مسلسل اٹھ رہی ہے (یہ بہرحال دوسرا موضوع ہے) آپ نے دیکھا کہ یہ تفریق، خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کی بنیادوں پر پیدا ہوئی۔ حضرات انبیاء کرامؑ نے (وحی خداوندی کی رو سے) کہا کہ یہ معیارِ تفریق باطل ہے۔ حقیقی معیارِ تقسیم، فکر و نظر (آئیڈیالوجی) کی ہم آہنگی ہے۔ زندگی کا ایک تصوّر مستقل اقدارِ خداوندی کی رُو سے متشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ اس تصوّرِ حیات میں ہم آہنگ ہوں، وہ رنگ، نسل، زبان اور وطن کے اختلاف کے باوجود ایک برادری کے افراد ہیں، جو اس تصوّر کو تسلیم نہ کریں وہ دوسری برادری کے افراد۔ قرآن کریم میں ہے:۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)

"خدا نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ نے بلند انسانیت کی زندگی سے انکار کر دیا، دوسرے گروہ نے اسے تسلیم کر لیا۔"

اور یوں نوعِ انسان دو گروہوں میں بٹ گئی۔ بلند سطحِ زندگی سے انکار کرنے والوں کو اصطلاح میں کافر کہتے ہیں، حقیقی زندگی کے تسلیم کرنے والوں کو مومن۔ کافر کے معنی انکار کرنے والا ہیں اور مومن کے معنی مان لینے والا۔ قرآن کریم کی رو سے، تفریقِ انسانیت کا یہی معیار ہے جس کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں، مومن اور کافر۔ یا مسلم اور غیر مسلم۔

حضرات انبیاء کرامؑ نے اس معیارِ تفریق کو محض نظری طور پر پیش نہیں کیا۔ اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہو کر دکھا بھی دیا۔ سلسلۂ وحی کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب ان کے زمانے میں، ان کی اپنی قوم میں، اس معیار کے مطابق تفریق پیدا ہوئی تو حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور اُن کا حقیقی بیٹا دوسری طرف، کیونکہ وہ مبنی بر وحی نظریۂ حیات میں ان سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے اس صحیح روشِ زندگی کو اختیار کرنے

سے انکار کردیا تو آپ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا کہ

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ۔ (۱۹/۴۸)

"میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں"

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ ان سے کہہ دیا کہ

إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ۔

"ہم تم ان سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو ان سب سے یکسر بے تعلق ہیں"

كَفَرْنَا بِكُمْ۔ "ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے۔ اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں"۔ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا۔ "تم ہو اور ہم ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی"۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت سے اور یہ نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کرو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے۔ حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ (۶۰/۴) اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں معیار یہ ہے کہ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي۔ (۱۴/۳۶) "جو شخص میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا (۶۶/۱۰) قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا آیا۔ تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دور آ گیا جب وحی کی تکمیل ہوگئی۔ اور اس کے مطابق نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روز روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔

قومِ رسولِ ہاشمی

اس تشکیلِ قومیت کے مطابق حبش کا بلالؓ، فارس کا سلمانؓ۔ اور روم کا صہیبؓ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) محمدِ عربیؐ کی "اپنی قوم" کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور حقیقی چچا، ابولہب "غیر قوم" کے افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آ گیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے تو ان کا باپ عتبہ دوسری طرف، حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اُس طرف۔ حضرت علیؓ اِدھر تھے تو ان کا بھائی عقیل اُدھر۔ نہیں! اور آگے بڑھئے۔ اِدھر خود محمدؐ تھے تو اُن کے مدِمقابل آپؐ کے حقیقی چچا عباسؓ اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیم انسانیت، جو وطن، رنگ، زبان، نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر، خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ اُمتِ محمدیہ۔

وہ ملّتِ اسلامیہ۔ وہ جماعتِ مومنین جو دنیا کے مختلف حصّوں کے اُن انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہِ اشتراک صرف ایمان تھا۔ یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد۔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ (۹/۷۱) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں"۔ اور ان کے مقابلہ میں نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم وَبَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ (۸/۷۳) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز"۔ اس کے بعد اس قومِ مومنین کو تاکید کر دی کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ۔

"اے جماعتِ مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔"

اس لئے کہ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا۔ "یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے"۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ۔ "ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں اُلجھے رہو"۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۤءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۔ "اُن کے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آ جاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ اُن کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے"۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (۳/۱۱۷) "ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے)۔ ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ۔ "اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے"۔ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (۳/۱۱۹) "اور اگر انہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے"۔[1]

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارکُ الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی، بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متمکن (ESTABLISH) ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے ۲۴/۵۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ، تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکامِ خداوندی کے مطابق کرنے ہیں۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) جو ایسا نہیں کرے گا وہ مومن نہیں کافر ہے۔ (۵/۴۴) قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو فرعی قوانین مرتب کرنے پڑیں انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو۔ (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸))۔ ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امورِ مملکت میں شریک و دخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہؐ کی مجلسِ شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی

---

[1] عدم گنجائش کے باعث یہاں صرف انہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید آیات کے لئے دیکھئے۔
۳/۲۴؛ ۴/۸۹؛ ۴/۱۳۹؛ ۴/۱۴۴؛ ۵/۵۵؛ ۸/۳؛ ۹/۱۰؛ ۵۸/۲۲؛ ۶۰/۱۱-۱۰۔

دے گانہ خلفائے راشدینؓ کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم۔ ان کی حکومت، خالصتاً جماعتِ مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس مملکت میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔ وہ "قومِ مسلم" کے افراد نہیں تھے۔

صدرِ اوّل کے بعد

اسلام کے صدرِ اوّل کے بعد جب دین، مذہب میں بدل گیا تو اس کے دیگر مہماتِ اصول کی طرح، قومیت کا یہ نظریہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور مسلمان بھی، دیگر قوموں کی طرح، نسل اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ گئے۔ صدیوں سے ہماری یہی حالت چلی آ رہی تھی کہ ہم میں اقبالؒ جیسا مفکر پیدا ہو گیا جس نے اپنی قرآنی بصیرت کی رُو سے (دین کی دیگر اساسات کی طرح) اس فراموش کردہ حقیقت کی بھی از سرِ نو یاددہانی کرائی کہ اُمّتِ محمدیہ کا نسلوں اور وطنوں کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ جانا، اسلام کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ پوری اُمت، ایمان کے اشتراک کی بنا پر اُمّتِ واحدہ ہے۔ فکرِ اقبالؒ کے عام ہو جانے کی وجہ سے آج ہمارے لئے یہ سمجھنا کہ اسلامی قومیت کا یہی معیار ہے، چنداں تعجب انگیز نہیں لیکن خود اقبالؒ کا اس قرآنی حقیقت تک پہنچنا بڑا تعجب انگیز تھا۔ وہ ۱۹۰۵ء میں (جب اس کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی) حصولِ تعلیم کے لئے یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ دانایانِ مغرب اس نظام کو نوعِ انسان کی مشکلات کا مدار قرار دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے۔ ان حالات میں ایک ایسے نوجوان طالب علم کا جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو، متشدّد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن مؤرخ کی نگاہ یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ ؎

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ ؎

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ ؎

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے!

اور وہ واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

وہ گیا تھا تو یہ سند لیش دیتا ہوا گیا کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ ؎

رازِ سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

چونکہ یہ نظریہ اسلامی نظامِ زندگی کی اصل اور بنیاد تھا، اس لئے علامہؒ نے اس کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اسے کس شدومد سے پیش کرتے تھے، اس کا اندازہ اس نظم سے لگائیے جو بانگِ درا میں "وطنیت" کے عنوان سے درج ہے۔ اور اس میں وہ کہتے ہیں ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفویؐ! خاک میں اس بت کو ملا دے

اس نظریہ کی مخالفت

میں نے اپنے مقالہ (شائع شدہ نوائے وقت۔ بابت ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء) میں بتایا تھا کہ جب قائدِ اعظمؒ نے سیکولر سٹیٹ کے خلاف اسلامی مملکت کا نظریہ پیش کیا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔ اسی طرح اقبالؒ کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کی شدید ترین مخالفت بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ اس کا خطیب کا بند اُن کی وہ بحث ہے جو (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ہوئی۔

شروع ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ مولانا مرحوم نے دہلی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ــــ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں"۔ ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم 'دیوبند' کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان، کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جا سکتا۔ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں یوں کہیئے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے اس خلافِ اسلام نعرہ کو سنا تو ان کے دلِ صد چاک سے ایک آہ اُبھری، جو ان الفاظ کی شکل میں فضا کو چیرتی ہوئی آں سوئے افلاک تک جا پہنچی کہ

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں "بمصطفےٰ برساں خویش را" کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے، لیکن اُمت، کی تشکیل اس رسولؐ کی نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اسلام کے پیرو، اُمتِ محمدیہ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جائے تو رسولؐ سے نسبت ختم ہو جائے اور جب رسولؐ سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰)

جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور اس طرح الگ الگ، فرقے، پارٹیاں، قومیں بن جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

یعنی اگر قومیت کی اساس، اسلام کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسولؐ سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر، علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے، رسول اللہؐ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت، وطن کے بجائے حضور نبی اکرمؐ کی طرف کرو۔ بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ——— اگر باو نرسیدی ——— اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو ——— تمام بولہبی است ——— پھر دین باقی نہیں رہتا، بولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف کی جاتی ہے۔ اس اصولی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہؒ نے کہا:۔

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی قابلِ قدر اور اہم تھا تو رسول اللہ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی؟ کیوں نہ رسول اللہؐ نے اسلام کو ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظِ قوم یا قومیت، ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیتِ وطنی قائم رکھی..... محمدؐ (فداہ ابی و امی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی، لیکن جب محمدؐ کی اُمت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہؐ کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب اُمتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے، اب "ملک و نسب" ان کا گرفتار ہو گیا۔

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را نہ داند نکتۂ دینِ عرب را!
اگر قوم از وطن بودے، محمدؐ ندادے دعوتِ دینِ بولہب را!

حضور رسالت مآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو تمہارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر حضورؐ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی، نبی آخر الزماںؐ کی راہ نہ ہوتی۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریۂ قومیت کو کس قدر اجمار کر اور سمیٹ کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن ابھی اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن اُمت کی تشکیل اس نبی کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر، اسے آج پھر دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُمت کی یہ تشکیل اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جسے سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے۔ مثلاً ایک عیسائی، حضرت عیسےٰؑ اور ان سے پہلے کے جملہ انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ حضرت عیسےٰؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے، یعنی نبوت کو حضرت عیسےٰؑ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے، اس لئے وہ اُمت حضرت عیسےٰؑ کا فرد (یعنی عیسائی) کہلاتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسےٰؑ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمدؐ رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے، وہ اُمت عیسویؑ سے کٹ کر ایک نئی اُمت یعنی اُمتِ محمدیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی اصول کی رُو سے، اگر کوئی شخص، محمدؐ رسول اللہ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ اُمتِ محمدیہ سے کٹ کر ایک نئی اُمت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسول اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ، اُمتِ محمدیہ سے کٹ جاتا ہے، اسی طرح وطن یا نسل کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی امتِ محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا۔ انہوں نے کہا کہ

> حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمدؒ یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں "انکارِ ختمیت" کا نظریہ وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ اُمت مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین و منشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے۔ جس طرح قادیانی نظریہ، ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی اُمتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور، ذاتِ رسالتمآبؐ سے اپنا رشتہ منقطع کر کے، ایک جدید اُمت، یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی یہ تنبیہہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی اور اس کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیئے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کے بجائے مولانا مدنی نے اپنے دعویٰ کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو "معرکہ دین و وطن" کے نام سے مشہور ہے۔ اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابلِ تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے اس معرکہ آرا بیان کو یہاں درج کرایا جائے، لیکن عدم گنجائش اس سے مانع ہے — (دلچسپی میں اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہے)۔

(ضمناً) مولانا مدنی (مرحوم) کے معتقدین میں سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس بیان کے بعد مولانا مدنی نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسلام کی رو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ آجکل قومیتیں، وطنیت کی بنا پر متشکل ہوتی ہیں۔ اور علامہ اقبالؒ نے ان کی اس معذرت (یا وضاحت) کو تسلیم کر لیا تھا، اس لئے اس قصہ کو اب دہرانا نہیں چاہتے۔ لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو سامنے نہیں لاتے کہ مولانا مدنی (مرحوم) نے حضرت علامہؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد، ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اقبالؒ کا موقف مبنی بر حقیقت نہیں تھا۔ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ طلوعِ اسلام نے اُسی زمانے میں اس کتابچہ کا مفصل جواب شائع کیا تھا جس کا کسی سے آج تک جواب بن نہیں پڑا۔ (یہ مقالہ باردیگر، طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا)۔

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو پیش کرتے رہے، لیکن یہ احساس ان کے دل میں برابر کھٹک پیدا کر رہا تھا کہ ان کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ان نظریات کو عملی طور پر کون آگے بڑھائے گا۔ جب آنے والا مورخ اس حقیقت پر نگاہ ڈالے گا کہ اس مقصد کے لئے ان کی نگہ انتخاب کہاں جا کر ٹکی تو وہ یقیناً محوِ حیرت رہ جائے گا۔ ان کی نگاہ کا ہدف تھا مسٹر محمد علی جناح۔ وہ جناح جو عمر بھر نیشنلسٹ رہا۔ اور پھر ہندوستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن کے گوشۂ خلوت میں جا بیٹھا تھا۔ اس قسم کے نیشنلسٹ کو اسلامی قومیت کے نظریہ کا ایسا معتقد بنا دینا کہ وہ اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دے لے — اقبالؒ کا وہ کارنامہ ہے جس سے ملتِ اسلامیہ ان کی ہمیشہ رہینِ منت رہے گی۔ یہ کیسے ہوا تھا، اس حقیقت کی پردہ کشائی قائدِ اعظمؒ کے سوانح حیات کا انگریز مرتب (ہیکٹر بولیتھو) ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

اپنے قیامِ لندن کے دوران مسٹر جناح نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناح نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہیں کیا۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔ (ص ۹۹)

جناحؒ انگلستان گیا تھا تو اس نیشنلزم کا پرستار جس کی شہادت آج بھی بمبئی میں "جناح کانگریس ہال" دے رہا ہے۔ اور واپس آیا تو اقبالؒ کا یہ پیغام دہراتا ہوا کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

قائدِ اعظمؒ نے اسلام کے اس تصورِ قومیت کو کس کس انداز سے پیش کیا، اس کی مثالیں آگے چل کر پیش آئیں گی۔ لیکن میں سب سے پہلے ان کا ایک ایسا فقرہ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے پوری تفصیل کو اس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:

پاکستان کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مسلم، اسلام لے آیا تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آ گیا۔ اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے، ایڈورڈس کالج۔ پشاور میں، ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو کہا تھا:—

ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین، ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شد و مد کے ساتھ ہوئی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے، آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں (مارچ ۱۹۳۷ء میں) کہا تھا کہ

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا تھا:

مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی

اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔

جب قائدِاعظمؒ نے اس تصورِ قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو) ایک خط میں لکھا:-

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی کا یہ خط، یوں سمجھئے کہ قائدِاعظمؒ کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں انہوں نے، مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ

اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے، نہ شک و شبہ، کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ برِصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے، کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے...... (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، سیاسی، معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں، اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض شور غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(جناحؒ کا خط بنام گاندھی۔ جنوری ۱۹۴۰ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائدِاعظمؒ نے فرمایا تھا:-

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب

ہے جو کبھی متحدہ قومیت نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے، ہندو اور مسلمان، مذہب کے ہر معاملہ میں دو دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مخالف ہے۔ دونوں الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصوّرات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظام مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

اس کے ایک سال بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس کے خطبہ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات، یا ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

قائداعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شدومد سے دہرایا کہ اس کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن، مسٹر این بی دت نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں جو اخبار مدینہ، بجنور کی یکم فروری سنہ ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی، لکھا تھا:۔

ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناحؒ نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصوّر کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ میرے خیال میں، اب نہیں، تو کل حقیقت ہو کر رہے گا...... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ البتہ اس میں ترمیم و اصلاح کر کے، اسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اور اس حقیقت کو، بالآخر، ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا۔ اور دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آگیا۔ اس موضوع پر، قائداعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ تشکیل پاکستان کے بعد بھی وہ کس طرح اس حقیقت کو دہراتے رہے، اسے ذرا آگے چل کر پیش کیا جائے گا۔

ہم نے اپنے مقالہ (مندرجہ نوائے وقت مورخہ ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء) میں کہا تھا کہ تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے مخالفین، قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کی تقریر کو ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کرتے ہیں؛

اور کہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ نہ تو اسلامی مملکت کے قائل تھے اور نہ ہی مسلمانوں کی الگ، قومیت کے مؤید۔ وہ وطن کی بنیادوں پر متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں (محولہ بالا تقریر کے ضمن میں) اسلامی مملکت کے مسئلہ پر تو وضاحت سے بحث کی تھی، لیکن نظریۂ قومیت کے سلسلے میں صرف اتنا کہا تھا کہ اس سے ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ مسلمان اور غیر مسلم اکٹھے مل کر وطن کی بنا پر ایک قوم بن جائیں گے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ غیر مسلم یہاں اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے اور اس حیثیت سے ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔

غیر مسلم اقلیتیں

انہوں نے (۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی محولہ بالا تقریر سے قریب ایک ماہ پہلے) ۱۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے، دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ اس میں ان سے جب پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:-

> میں ان وعدوں سے جو میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کئے ہیں، منحرف نہیں ہوں گا۔ میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ انہیں پورا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ میں جو بھی کہتا ہوں، اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اقلیتوں کو خواہ وہ کسی جماعت اور کسی فرقے سے متعلق ہوں بہر طور پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات و عبادت کی پوری آزادی ہوگی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ان کی جان، ان کے مال اور ان کے تمدن کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انہیں بلا تفریقِ مذہب و ملت و رنگ ہر صورت میں پاکستان کا باشندہ تصور کیا جائے گا۔
>
> (بحوالہ نوائے وقت۔ مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۴۸ء)

آپ نے دیکھا کہ قائدِ اعظمؒ نے اس میں، پاکستان کے غیر مسلم کو اقلیتیں کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ان کی ۱۱ اگست کی تقریر سے ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد انہوں نے (اس تقریر کے تین ہی دن بعد)

۱۱ اگست کے بعد

۱۴ اگست کو مجلسِ آئین ساز کا افتتاح کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے ویسا ہی کشادہ ظرفی اور رواداری کا سلوک کیا جائے گا جیسا شہنشاہِ اکبر نے کیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

> شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آرہا تھا جب حضور نبی اکرمؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ان سے لفظاً ہی نہیں بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی اور ان کے مذہب اور عقائد کو عزت و

احترام کی نظروں سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسنِ سلوک کے) انہی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا اور انہیں پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہیئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائدِ اعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہو گی؟ اس ضمن میں آپ اس نکتہ پر بھی غور فرمایئے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جن یہودیوں اور عیسائیوں سے حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا تھا، وہ مسلم قوم کا جزو نہیں بن گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ان کی حیثیت ذمّیوں کی تھی۔ یہ حقیقت بجائے خویش اسلامی نقطۂ نگاہ سے "دو قومی نظریہ" کا بین ثبوت ہے۔

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے۔ جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ یہاں اُن سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار اُبھرتا ہے، اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ میں نے جلوت اور خلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں سے حسنِ سلوک کا ثبوت دینا چاہیئے۔ تقسیم ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہٰذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی، انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہو گا۔

پھر انہوں نے ۳۰ اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے۔ خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے۔ اور ان کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمارا یہی رویہ ہمارے لئے باعثِ عزت اور وجہِ افتخار ہونا چاہیئے۔

۲۳ فروری ۱۹۴۸ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے، خوف اور بداعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے"۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا:۔

اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہلِ مذہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی میاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے، ہم ان کے اس تعاون کا گرم جوشی سے استقبال کریں گے۔

انہوں نے ۲۱ مارچ سنہ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانے میں اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور ان کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت ...... ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے، اسی تقریر کے دوران فرمایا:-

اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے ——— اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے (کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں سکھایا ہے) کہ آپ کچھ بھی ہوں، اوّل و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لئے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی۔ نہ سندھی کی ہے نہ پٹھان کی۔ یہ آپ سب کی ہے ...... اس لئے اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجئے۔ صوبائی تفریق ایک لعنت ہے۔ ویسی ہی لعنت جیسی فرقہ بندی، شیعہ سنی کی تفریق ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا:-

میں اس موقعہ پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں گے۔

آپ نے دیکھا کہ اس تقریر کے پہلے اقتباس میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں "ایک قوم" کہا ہے۔ اور دوسرے اقتباس میں، غیر مسلموں کو اقلیتیں ——— فرمائیے کہ ایسا کہنے والا "دو قومی نظریہ" کا علمبردار تھا، یا متحدہ قومیت کا؟

انہوں نے ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔

۳ جون سنہ ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائد اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلا تمیز مذہب و ملت اور بلا لحاظ رنگ و نسل ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو

اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔

آپ نے دیکھا کہ قائدِ اعظمؒ اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر پکارتے رہے۔ اور انہیں ان کی جان، مال اور عزت، آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں، اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص، نظریۂ زندگی کی بنا پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اس براڈ کاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کہا کہ

> یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہؐ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں وحدت اور اخوت کا بڑا گہرا اور خاص جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات، ہمارے اپنے نظریات، زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائدِ اعظمؒ نے قومیت کی تشکیل کے لئے کون کون سے اجزا کو لابنفک قرار دیا؟ کیا یہ وہی اجزا نہیں جن کے امتزاج سے مسلم قوم یا اُمتِ مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے کہیں بھی یہ کہا تھا کہ ہم (پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم) اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن چکے ہیں؟

پھر انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو مملکتِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اس پیغام میں جو اُن کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ" کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے "مسلم سٹیٹ" کہا ہو، اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے، ہر موقعہ پر مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرین سیاست سے کہ جو مملکت محض وطنیت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو، اسے کبھی بھی، مسلم سٹیٹ، ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جا سکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت کی بنیادوں پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوئی ہو، اس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اس بحث کے سلسلہ میں جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروا ہیں۔

لہٰذا، قائدِ اعظمؒ کا مملکتِ پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے

قائل نہیں تھے۔

نئی نسل کی تعلیم

یہ تھے دو قومی نظریہ کے متعلق قائد اعظمؒ کے خیالات۔ میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوراً بعد، مملکت کے اربابِ حل و عقد کی خدمت میں گذارش کیا تھا کہ مذہب (دین) کی بنیادوں پر ایک مملکت اور ایک جداگانہ قومیت کا تصور دنیا میں رائج نظریاتِ سیاست کے خلاف اور انوکھے نظریات ہیں۔ ہم (پرانی نسل کے افراد) تو ان سے یہ کچھ پکا رتے ہوئے یہاں آگئے ہیں، لیکن ہماری نئی نسل کی سمجھ میں یہ بات از خود نہیں آسکے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم کا انتظام ایسا کیا جائے کہ یہ نظریات علیٰ وجہ البصیرت ان کی زندگی کا جزو بن جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ عام نظریاتِ سیاست سے متاثر ہو کر سیکولر سٹیٹ اور وطنی قومیت کا قائل ہو جائے گا، اور اس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کی وجہ جواز ہی ختم ہو جائے گی۔ ان حضرات نے میری ان گذارشات پر کوئی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ کہ یہ زہر ہماری نئی نسل کے رگ و پے میں سرایت کرتا گیا۔ ملک میں موجود پاکستان دشمن عناصر اس زہر آلودہ خون کی گردش کو تیز سے تیز تر کرتے چلے گئے اور اس کا عملی مظاہرہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں ہوا۔ تعلیم کی طرف سے ہماری مجرمانہ تغافل شعاری کی وجہ سے وہاں کے طالب علموں کی ذہنیت کیا بن چکی تھی، اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے (اس زمانے کے) ایم اے فائنل کے ایک طالب علم عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو روزنامہ (DAINIC PAKISTAN) کی اشاعت بابت ۷ مئی سنہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا ہے کہ ہم، مذہب کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ

> ہم سری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بجائے سنگھ، جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسیٰ اور علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا، اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا، یعنی اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے اور رانگنی، کھاگنی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ دیا۔

اس کے بعد میں نے لکھا تھا:۔

> اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب، اور وجوہات معلوم کرنے کے لئے ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے رہے، لیکن یہ سب بے سود رہا۔ اس کا بنیادی سبب وہ ذہنیت تھی جس کی جھلک عزیز الرحمٰن کے مندرجہ بالا خط میں صاف نظر آ رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد، سقوطِ ڈھاکہ کے جگر خراش المیہ پر شادیانے بجاتے ہوئے بنگلہ دیش کے اُس وقت کے قائم مقام صدر، مسٹر نذرالاسلام نے اعلان فرمایا تھا کہ

ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی، یہ فتح ہے حق کی باطل پر، یہ فتح ہے، ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے سرپھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش کریں، ورنہ جو حشر مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا، حقائق کسی کے جھٹلائے جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

مسز اندرا گاندھی

ادھر نذرالاسلام صاحب یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف (اس زمانہ کی مہاتما کی وزیرِ اعظم) مسز اندرا گاندھی اپنی پارلیمان میں جشنِ "فتح بنگالہ" پر ہدیۂ تبریک کے جواب میں یہ فرما رہی تھیں کہ

یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے حق کی، حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب ۲۵ سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے، وہ حق تھا۔ اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

(سابقہ مشرقی پاکستان) حالیہ بنگلہ دیش میں اس ذہنیت نے ملک کو دو لخت کر دیا۔ ادھر مغربی پاکستان میں اس ذہنیت کی پرورش کے لئے دوسرا انداز اختیار کیا گیا۔ یہاں کہا گیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم

نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں۔

قارئین کو شاید یاد ہو کہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کی "عوامی ادبی" انجمن کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس پر منجملہ دیگر "دانشورانِ قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا۔

> ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کیے جائیں کہ سب قومیں ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خودمختارانہ ترقی کر سکیں۔
>
> ہمارے نزدیک، پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

یعنی سیکولر ملکوں میں تو وطن کی چار دیواری کے اندر بسنے والے تمام افراد ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یہاں ان حضرات نے اس نظریہ کی ترویج شروع کی کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے الگ الگ قوم ہیں۔ یعنی یہ "اربابِ دانش" سیکولرسٹ سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے! ادھر تقسیم ہند کے سب سے شدید مخالف خان عبدالغفار خان بھی اسی قسم کے نظریات عام کرنے میں برابر مصروف ہیں۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں "ٹائمز آف انڈیا" کے نمائندے، مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی۔" انہوں نے یہ بات کوئی پہلی مرتبہ نہیں کہی۔ وہ جب ۱۹۶۹ء میں کابل سے بھارت گئے تھے تو انہوں نے وہاں کہا تھا کہ

> میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا، نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے۔ جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی، لہٰذا میں اسے کس طرح تسلیم کر لوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔
>
> (سٹیٹسمین ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء بحوالہ پاکستان ٹائمز ۲۳/۱۰ ۱۹)

ادھر والدِ بزرگوار یہ فرما رہے تھے اور ادھر ان کے صاحبزادہ خان عبدالولی خاں، یہ اعلان کر رہے تھے:۔

> دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔
>
> (نوائے وقت۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

میں نے پہلے لکھا ہے کہ بنگالی طالب علم، عزیز الرحمن نے اپنے خط میں کہا تھا کہ اب وطن پرستی کی ذہنیت

مشرقی پاکستان سے آگے بڑھ کر سندھ میں سرائت کر رہی ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ "حریت" کی اشاعت بابت ۴ نومبر سنہ ۱۹۶۸ء میں ایک سندھی طالبہ مس نسیم تھل کا ایک خط چھپا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ

> وہ اسلام اور پاکستان، جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجوڈارو۔ کوٹ ڈجی خان کے آثار قدیمہ اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے۔ (نہ کہ اسلام کی وجہ سے) (طلوع اسلام۔ دسمبر سنہ ۱۹۶۸ء)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہاں کے بہاری (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی (اور ان پر مصائب و آلام کا جو سلسلہ اب تک جاری ہے) اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے سندھ کی ایک ادیبہ، غزالہ بلوچ۔ کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی ۱۹ اگست سنہ ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا:۔

> اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پُرمسرت حالت میں ہوتے لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان ـــ ایک پاکستان کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت، اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اس دن شروع ہوئی تھی جب انہوں نے سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔ (طلوع اسلام۔ اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ء۔ صفحہ نمبر ۴۳)

وہاں کے نوجوان طبقہ میں یہ ذہنیت از خود پیدا نہیں ہو گئی تھی وہاں کے "بزرگ سیاستدانوں" نے جب اپنی گاڑی کا رُخ بدلا تو اس سے ساری فضا متاثر ہو گئی۔ سندھ کی "بزرگ ترین سیاسی شخصیت" مسٹر جی ایم سید کی تھی۔ وہ مسٹر سید جنہوں نے سب سے پہلے سندھ میں مسلم لیگ کو متعارف کرایا تھا اور بعد میں ان کی

کیفیت یہ ہو گئی کہ اوائل ۱۹۷۲ء میں جب ان کی سالگرہ منائی گئی تو اس تقریب پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

پاکستان کے موجودہ انتشار، افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے۔ یعنی دو قومی نظریہ، مذہبی نظام حکومت کا تخیل، فسطائی نظریہ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔

اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ

۲۴ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیرباد کہا جائے، یا پاکستان میں پانچ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں کو ملکی خود مختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے۔

(المنبر۔ ۴ فروری ۱۹۷۲ء)

سندھ سے آگے بڑھ کر بلوچستان کی طرف آیئے۔ وہاں کے (اس زمانے کے) وزیر اعلیٰ، سردار عطاء اللہ مینگل نے ۱۹۷۲ء میں کہا تھا کہ

جس دو قومی نظریہ کی اساس پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ خلیج بنگال میں غرق ہو چکا ہے۔

(نوائے وقت۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

اور وہاں کے گورنر میر غوث بخش بزنجو نے ملتان کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا:۔

پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کی تاریخ، جغرافیائی حدود، تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا معاشرہ جدا ہے۔ ہمارا مطالبہ اتنا ہے کہ ان کے نازک احساسات کا خیال رکھا جائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ پھر پاکستان کو متحد رکھنے کی کیا اساس ہے — انہوں نے کہا کہ چار قومیتوں کے مجموعہ سے ایک پاکستانی قوم بنے گی۔ جب ہم آپس میں بات کریں گے تو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں ہوں گے۔ جب کسی غیر ملک سے بات ہو گی تو پاکستانی قوم کی بات ہو گی۔ (نوائے وقت۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

(کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ جب سارے ملک میں قومیں الگ الگ ہوں گی تو پاکستانی قوم کی بات کون کرے گا؟) میں اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے زیر نظر مقصد کیلئے سردست اتنا ہی کافی ہے۔ (میں مزید تفاصیل کسی دوسرے وقت پر اٹھائے رکھتا ہوں)۔

(۰)

اس وقت تک دو قومی نظریہ سے متعلق گفتگو پاکستان کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ لیکن، جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے یہ نظریہ نہ تو تحریکِ پاکستان کے کسی سیاسی محرک کی تخلیق تھا اور نہ ہی پاکستان یا کسی اور ملک سے وابستہ یا اس تک محدود۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جو کفر اور اسلام کی تفریق کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے، اس لئے کوئی اہلِ ایمان، جہاں بھی ہے،

وہ عظیم اُمتِ مسلمہ کا فرد ہے اور جغرافیائی بُعد اور مسافت اُسے نہ اُس اُمت سے الگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسری قوم کا جزو بنا سکتے ہیں۔ اسلام چھوڑنے کے بعد ہی کسی دوسری قوم کا جزو بن سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جب دو قومی نظریہ کا تصور پیش کیا تھا تو اُسے صرف ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا تھا۔ (پاکستان کا اُس زمانے میں ابھی تصور تک بھی ذہنوں میں نہیں آیا تھا)۔ انہوں نے اس پیغام کو تمام دنیا کے مسلمانوں تک پھیلا دیا۔ (مثلاً) انہوں نے ۱۹۲۲ء میں، پہلی جنگِ عظیم کے بعد، تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالمِ اسلام کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ یاد رکھو ہماری نکبت و زبوں حالی کا ایک ہی علاج ہے، اور وہ یہ کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر!
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

اور اس سے اگلے سال (۱۹۲۳ء میں) انہوں نے اپنی مشہور نظم، طلوعِ اسلام میں انہی اقوام کو مخاطب کر کے کہا کہ ؎

ہوس نے کر دیا ٹکڑے ٹکڑے مسلماں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا!
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے!
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

وہ عمر بھر اسی طرح وحدتِ اُمت کے اس پیغام کو عام کرتے رہے، اس لئے کہ وہ حقیقی اسلام کے داعی تھے اور اسلام اور وحدتِ اُمت لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن مسلمانانِ عالم، جو حقیقی اسلام کو نظر انداز کر کے دنیا کی دوسری قوموں کی طرح جغرافیائی حدود میں بٹ کر مختلف قومیں بن چکے تھے، انہوں نے اس پیغام کا کوئی اثر نہ لیا۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اس نظریے کو عملی شکل دینے کے لئے اسے پاکستان کے خطۂ زمین تک سمٹایا اور اس کی ابتدا ہندوستانی مسلمانوں سے کی۔ انہوں نے اس خطۂ زمین کا تصور ہی اس لئے دیا تھا کہ اس میں اسلام کو اس کی حقیقی شکل میں عملاً نافذ کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے اسلام، دو قومی نظریہ، اور پاکستان ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے تھے۔ پاکستان وجود میں آ گیا، لیکن یہ دیکھ کر تاسف ہی نہیں صدمہ ہوتا ہے کہ اس میں حقیقی اسلام کا احیاء تو ایک طرف، ہم پاکستانی مسلمان بھی ایک اُمت نہیں بن سکے۔ ہم میں صوبائی تقسیم بدستور قائم ہے۔ یہ صوبائی تقسیم نہیں، درحقیقت نسلی تفریق ہے، اور وہ بھی اس قدر گہری کہ ایک ہی نسل کے ایک ہی صوبے میں بسنے والے پاکستانی مسلمان ہندوؤں کی طرح ذاتوں، برادریوں، گوتوں تک میں بٹے ہوئے ہیں،

اور باہمی تفریق و تقسیم کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم میں قدرِ مشترک صرف مسلمان کا لفظ ہے۔ اِس سے زیادہ اس کا مفہوم کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اگر ہم ..... دو قومی نظریہ کے الفاظ دہراتے رہیں تو اس کا عملی نتیجہ تو کچھ نہیں نکل سکے گا۔ لہٰذا، جہاں ہم اُن لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو دو قومی نظریہ کے مخالف ہیں، ہمیں ان لوگوں کی بھی اُسی طرح مخالفت کرنی چاہیئے جو لفظی طور پر تو دو قومی نظریہ کے قائل ہیں، لیکن عملاً ایک اُمت بننے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے۔ اس وقت مسلمانانِ عالم کے لئے بالعموم اور پاکستانی مسلمانوں کے لئے بالخصوص مقدم ترین مسئلہ وحدتِ اُمت کی تشکیل کا ہے۔ جب تک یہ وحدت قائم نہیں ہوتی نہ مملکتی سطح پر ہمارا کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے، اور نہ ہی بین المملکتی سطح پر۔

دِین

اپنی مکمّل، عملی شکل میں عہدِ فاروقیؓ میں قائم ہوا۔
اس کے کچھ عرصہ بعد یہ مذہب میں بدل گیا۔
دِین کی وہ شکل کیا تھی اور یہ مذہب میں کیسے تبدیل ہو گیا؟ اس کی تفصیل پرویز صاحب کی مایۂ ناز کتاب

شاہکارِ رسالتؐ

میں ملے گی۔
قیمت مجلد -/۵ روپے ——— (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی قوانین

للہ الحمد کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف ——— قرآنی قوانین ——— ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادیت نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے۔

قیمت فی جلد (مجلد ہمیشہ روپے (علاوہ محصولڈاک) ملنے کا پتہ ★

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ○ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

ایک کمیونسٹ نوجوان سے

اگلے دنوں ایک نوجوان طالب علم ملنے کے لئے آیا۔ اس نے کہا کہ ایک کمیونسٹ اکثر اس قسم کے خیالات پھیلاتا رہتا ہے کہ "خدا کا تصور افیون ہے جسے سرمایہ دار طبقے نے اس لئے وضع کر رکھا ہے کہ غریبوں کو اس فریب میں مبتلا رکھا جائے کہ غریبی اور امیری خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے تونگر بنا دے۔ جسے چاہے محتاج کر دے۔ اس میں کسی کا کچھ اختیار نہیں۔ اس سے سرمایہ داروں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غریبوں کا خیال تک بھی کبھی اس طرف نہ آنے پائے کہ ان کی محتاجی اور غریبی کا موجب سرمایہ دار طبقہ ہے، اور وہ اس طرح مطمئن ہو کر غریبوں کا خون چوستے رہیں"۔ اس نوجوان نے کہا کہ اس قسم کے خیالات عام طور پر طالب علموں میں پھیلائے جاتے ہیں اور چونکہ انہیں مذہب کے متعلق کچھ معلومات نہیں ہوتیں، اور سطحی طور پر کمیونسٹوں کے یہ دلائل جی کو لگنے والے ہوتے ہیں اس لئے یہ زہر سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا جواب ضرور دینا چاہیئے۔

طلوعِ اسلام ہم اس کے جواب میں کمیونسٹ نوجوان کو براہِ راست مخاطب کرتے ہیں۔

ہمارے عزیز! یہ خیال کہ مذہب (یا خدا کا تصور) ایک افیون ہے جس سے غریبوں کو غریبی کے نشے میں مست رکھا جاتا ہے، مارکس کا پیدا کردہ ہے۔ مقصد اس سے وہی ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی اس سے غریبوں کو اس فریب میں رکھا جاتا ہے کہ تمہاری یہ حالت (اور امیروں کی امیری) خدا کی طرف سے ہے۔ نہ وہ اپنی اس حالت کو غریبی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ نہ تم اپنی غریبی کو امیری میں بدل سکتے ہو۔ تم مجبور ہو، اس لئے تم اپنی حالت پر شاکر و صابر رہو۔ یعنی اس تصور میں قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ اس سے انسان کو مجبور بنا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اس کا خیال تک بھی دل میں نہ لائے۔

قبل اس کے کہ ہم یہ بتائیں کہ اسلام کی اس باب میں کیا تعلیم ہے ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ خود مارکسزم کی رُو سے اس ضمن میں حقیقی پوزیشن کیا ہے۔ یعنی مارکسزم کے فلسفہ کی رو سے انسان مجبور ہے یا صاحبِ اختیار و ارادہ! مارکسزم کے فلسفہ کی بنیاد مادی جدلیت (DIALECTIC MATERIALISM) پر ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے جو بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنی انتہا تک جا پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک اور نظام نکلتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اس سے وہ پہلا نظام ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ نیا نظام لے لیتا ہے۔ پھر اس نظام کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک اَن دیکھی قوت کے زور پر ہوتا ہے جسے تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کہا جاتا ہے۔ پہلے غلامی کا دور تھا۔ پھر جاگیرداری کا نظام آیا۔ اس کے بعد کارخانہ داری شروع ہوئی۔ یہ سب نظامِ سرمایہ داری کے مختلف پہلو تھے۔ اب اسی جدلیت کے مطابق نظامِ سرمایہ داری کے خاتمہ کا وقت آپہنچا ہے۔ اس کی جگہ اشتراکی نظام قائم ہوگا۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ تاریخی وجوب کا تقاضا ہے

جس کا رُخ کوئی نہیں موڑ سکتا۔ ساری دنیا کے سرمایہ دار مل کر کوشش کر کے دیکھ لیں۔ تاریخی وجوب کی بے پناہ قوت کے سامنے ان کی کوئی پیش نہیں جا سکے گی۔

یہ ہے مارکسزم کا فلسفہ۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا اس فلسفہ کی رو سے انسان مجبور قرار پاتا ہے یا صاحبِ اختیار و ارادہ ٹھیرتا ہے؟ دنیا میں دو چار ہزار سال سے نظامِ سرمایہ داری قائم تھا۔ یہ نظام قائم تھا تاریخی وجوب کی بے پناہ قوت کے بل بوتے پر جس کا مقابلہ کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر اس زمانے میں ساری دنیا کے سارے غریب مل کر بھی چاہتے کہ اس نظام کو الٹ دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ تاریخی وجوب ان کے دانت توڑ کر رکھ دیتی۔ لہٰذا، غریب اور کمزور اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ وہ اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ اُس وقت نظامِ سرمایہ داری کے الٹنے کی خواہش یا کوشش کرتے تو کوئی مارکس اُٹھ کر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور ان سے کہتا کہ تمہاری کیوں عقل ماری گئی ہے جو تاریخی وجوب سے ٹکر لینے کی ٹھان رہے ہو! تم اسے الٹ نہیں سکتے۔ جب تک تاریخی وجوب، موجودہ دور کے خاتمہ کے بعد اسے الٹ نہ دے۔ تمہیں اس حالت میں زندگی بسر کرنا ہوگی۔ تم اس باب میں مجبور ہو۔ تمہاری اس تباہی کا ذمہ دار سرمایہ دار طبقہ نہیں۔ وہ بیچارے تو خود تاریخی وجوب کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ نہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے سرمایہ دار ہیں۔ نہ تم اپنے اختیار و ارادہ سے غریب اور مزدور ہو۔ حتیٰ کہ اگر وہ چاہیں بھی کہ تم پر رحم کھا کر تمہاری حالت کو بدل دیں تو وہ پھر بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ ان کی یہ کوشش تاریخی وجوب کے تقاضے کے خلاف ہوگی، جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

فرمائیے عزیزم! جس اعتراض کی بنا پر آپ خدا کے تصور کو افیون قرار دیتے ہیں کیا مارکسزم کا فلسفہ بعینہٖ وہی نتائج نہیں پیدا کرتا؟ اس صورت میں کیا مارکسزم کا فلسفہ بھی افیون نہیں جو انسان کو یہ بتاتا ہے کہ تم تاریخی وجوب کے ہاتھوں مجبور ہو، اس لئے تم اپنی حالت کے بدلنے کا خیال تک بھی دل میں نہ لاؤ۔

اس فلسفہ کی رُو سے جو اور نتائج مرتب ہوتے ہیں ذرا انھیں بھی ذہن میں رکھیئے۔ آپ کہتے ہیں کہ تاریخی وجوب کی رُو سے نظامِ سرمایہ داری کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اب اس کی جگہ دوسرا نظام قائم ہوگا۔ اگر سرمایہ دار طبقہ کہے کہ تم غلط کہتے ہو کہ اس نظام کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اس کا دور ابھی کچھ عرصہ تک اور باقی رہے گا۔ تو آپ کے پاس ان کے اس دعوے کی تردید کی کیا دلیل ہے؟ آپ کس طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی وجوب کی رُو سے پہلے نظام کی مدت ختم ہو چکی ہے؟ نہیں! اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ آپ کے پاس خود تاریخی وجوب کے وجود کا ثبوت کیا ہے؟ کیا آپ اس پر محض اس لئے ایمان نہیں لا رہے کہ مارکس نے ایسا کہہ دیا ہے؟ کیا آپ اسے عقیدۃً نہیں مان رہے؟ اگر صورت یہی ہے تو پھر حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ آپ نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے جس کا خدا (معاذ اللہ) تاریخی وجوب ہے جس کا پیغمبر (پناہ بخدا) مارکس ہے اور جس کا کلمہ مادی جدلیت ہے؟ اور جس میں انسان بیچارا اس "بتِ خدا" (تاریخی وجوب) کے ہاتھ میں مجبور و مقہور ہے۔

دوسرے یہ کہ جب تاریخی وجوب کا یہ فیصلہ ہے کہ اب نظامِ سرمایہ داری ختم ہو جائے گا اور اس کی جگہ مزدوروں کا نظام مسلط ہو جائے گا تو آپ اس جدید نظام کے قیام کے لئے اس قدر ہاتھ پاؤں کیوں مار رہے ہیں؟ آپ مزدوروں سے کیوں کہہ رہے ہیں کہ آپس میں متحد ہو کر نظامِ کہن کی بساط اُلٹ دو۔ آپ کیوں ہر جگہ فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں؟ آپ کیوں ایٹم بم کی دہشت سے نظامِ سرمایہ داری کو تباہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ کیا تاریخی وجوب میں اس کی قوت نہیں کہ وہ از خود اس فرسودہ نظام کو تباہ کر کے اس کی جگہ اشتراکیت کا نظام قائم کر دے؟ اگر یہ انقلاب آ کر رہنا ہے اور ساری

دنیا کی متحدہ قوت بھی اسے روک نہیں سکتی تو آپ اس قدر مضطرب و بیقرار کیوں ہیں ؟

اس کے بعد یہ سوچئے کہ آپ نظامِ سرمایہ داری کو انسانیت کے لئے زہرِ قاتل قرار دے کر اس کی ہزار ہا برائیاں بیان کرتے ہیں ۔ (یہ سب ٹھیک ہے) لیکن سوال یہ ہے کہ جب یہ نظام بھی تاریخی وجوب ہی کا قائم کردہ تھا تو پھر آپ اس پر اعتراض کس طرح کر سکتے ہیں ؟ اور اس کے بعد اس پر بھی غور کیجئے کہ جب اشتراکی نظام کا دور ختم ہو جانے کے بعد جدلیت کے اٹل چکر کی بنا پر پھر (اس نظام کی ضد) نظامِ سرمایہ داری کا زمانہ آجائے گا تو کیا اُس وقت آپ اشتراکی نظام کی خرابیاں بیان کر کے، لوگوں کو نظامِ سرمایہ داری قائم کرنے کی تلقین کریں گے ؟ لیکن اس تلقین سے ہوگا کیا ؟ جن مزدوروں کے ہاتھ میں آپ آج زمامِ اقتدار دے رہے ہیں، یہ بیچارے پھر حسبِ سابق محکوم و محتاج ہو جائیں گے اور سابقہ سرمایہ دار پھر برسرِ اقتدار آجائیں گے ۔

یہ ہے مارکسزم کے فلسفہ کا عملی نتیجہ ! حقیقت یہ ہے کہ (اگرچہ یہ بات بظاہر کتنی ہی متضاد کیوں نہ دکھائی دے لیکن بادنیٰ تعمق انسان اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ) اشتراکیت کا فلسفہ بھی اسی قسم کا رجعت پسندانہ (RE - ACTIONARY) فلسفہ تھا جس قسم کے (غلط) فلسفے رجعت پسند طبقہ کی طرف سے اس سے پیشتر پیش ہوتے رہے ہیں ۔ ایک وقت میں یہ فلسفہ پیش ہوا کہ بادشاہوں کو خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) حاصل ہیں، اس لئے دوسرے انسانوں پر ان کی اطاعت لازم ہے ۔ یہ فلسفہ بھی "افیون" تھا کیونکہ عام انسانوں کو اطاعت پر مجبور قرار دیتا تھا ۔ دوسرے وقت میں یہ فلسفہ پیش ہوا کہ دُنیا میں انسان کا مقام اس کے سابقہ جنم کے اعمال کی رو سے متعین ہوتا ہے ۔ جو شودر کے گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ جنم کے بُرے اعمال کا نتیجہ بھگتنے کے لئے اُس دنیا میں جاتا ہے ۔ جو برہمن کے ہاں جنم لیتا ہے، وہ اپنے سابقہ کرموں کا پھل پاتا ہے ۔ ان میں سے نہ کسی نے یہ پوزیشن اپنے لئے خود متعین کی ہوتی ہے اور نہ ہی اسے اس کا اختیار ہوتا ہے کہ اس پوزیشن کو بدل سکے ۔ شودر کا فریضہ ہے کہ وہ برہمن کی خدمت کرے اور برہمن کا حق ہے کہ وہ اس سے خدمت لے ۔ اسی طرح غریبی اور امیری، رنج اور راحت، خوشحالی اور بدحالی، صحت اور بیماری کو بھی لکھا اور لکھ (قسمت کی لکیر) سے وابستہ کر کے انسان کو اپنی حالت پر مطمئن رہنے کی تلقین کر دی جاتی تاکہ اُس کا خیال ان گوشوں کی طرف آنے ہی نہ پائے جو اس کی ان تباہیوں اور بربادیوں کے ذمہ دار ہیں ۔ یہ کچھ سابقہ رجعت پسندوں نے کیا ۔ اور اسی قسم کا فلسفہ مارکسزم نے پیش کر دیا کہ نظام ـــــ خواہ وہ کسی قسم کا بھی کیوں نہ ہو ـــــ انسانوں کے ہاتھوں کا قائم کردہ نہیں، بلکہ تاریخی وجوب کا آوردہ ہوتا ہے ۔ اس لئے انسان اس باب میں یکسر مجبور ہے ۔ کہئے کہ اس فلسفہ میں اور سابقہ رجعت پسندوں کے فلسفہ میں کیا فرق ہے ؟ اس وقت اسے آپ اس لئے موجبِ خیر و برکت قرار دے رہے ہیں کہ اتفاق سے تاریخی وجوب کی گردش سے سابقہ سرمایہ دارانہ نظام ختم ہو رہا ہے ۔ لیکن کل کو جب دوسرے چکر کی باری آئے گی تو یہی فلسفہ مزدوروں اور غریبوں کے حق میں لعنت بن جائے گا اور انہیں اسی قسم کی افیون پلائے گا جس قسم کی افیون سابقہ رجعت پسندانہ فلسفے پلاتے تھے اور جسے چھڑانا آپ بہت بڑا جہاد قرار دے رہے ہیں ۔

یہ تو رہا اس سوال کا منفیانہ گوشہ ۔ اب آیئے اس کے مثبت پہلو کی طرف ۔ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے زمانے پر نگاہ ڈالئے ۔ وہ رجعت پسندانہ فلسفے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ساری دُنیا پر مسلط تھے اور پورے شباب پر تھے ۔ وراثتی ملوکیت اور بادشاہوں کے خداوندی اختیارات کا نظریہ ۔ پیدائش کی رُو سے انسانوں کی ابدی تقسیم کا نظریہ ۔ انسانوں کے

اوّلین "ماں باپ" کے گناہوں کی پاداش میں ہر انسانی بچہ کا اپنی پشت پر گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہونے کا عقیدہ۔ خوشحالی اور بدحالی کو تقدیر سے وابستہ کر دینے کا عقیدہ۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں انسان کو یکسر مجبور اور بے بس قرار دینے کا ہر نظریہ، انسانی فکر و نظر پر پوری طرح مسلط تھا ـــــ اور اگر مارکسزم کے تاریخی وجوب کے فلسفہ کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ دور وہ تھا جس میں سرمایہ دارانہ نظام کا تسلط تھا جسے مارکسزم کے نظریہ کی رُو سے کوئی طاقت بدل نہیں سکتی تھی۔

اُس زمانہ اور ان حالات میں ایک شخص (علیہ تحیۃ والسلام) اٹھتا ہے اور ساری دنیا سے للکار کر کہتا ہے کہ تمہارے یہ تمام نظریات باطل اور مفاد پرستانہ ذہنیت کے پیدا کردہ ہیں۔ تمہارا صاحبِ قوت و دولت طبقہ (گروہ مترفین) غاصبانہ نظام قائم کرتا ہے اور عوام کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے "خدا" کی طرف منسوب کر دیتا ہے (یا آج کی اصطلاح میں اُسے تاریخی وجوب کہہ کر) عوام سے کہہ دیتا ہے کہ تم اسے بدلنے پر قادر ہی نہیں) وہ غاصبانہ نظام کے حاملین سے کہتا ہے کہ یہ سب تمہاری سازش ہے، تم غریبوں اور ناداروں کو خود ہی کچل کر رکھ دیتے ہو اور پھر ان کے متعلق کہتے ہو کہ اُن میں اُبھرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ یہ پیدا ہی اس لئے کئے گئے ہیں کہ بلند صلاحیت والے طبقہ کے خدمت گار اور اطاعت گزار رہیں۔ تم ان کے بچوں کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھتے ہو اور زندگی میں آگے بڑھنے کے تمام دروازے ان پر مسدود کر دیتے ہو، اور پھر یہ مشہور کرتے رہتے ہو کہ جاہل اور ذلیل رہنا ان کی تقدیر میں تھا۔ تم رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہو اور محتاجوں اور ناداروں سے یہ وعظ کہتے رہتے ہو کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو وہ تمہیں امیر کیوں نہ بنا دیتا اُس (ذاتِ قدس و اعظم) نے ان مترفین سے یہ کہا اور غریبوں اور ناداروں کے سر دست شفقت رکھتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں کے فریب میں نہ آجانا۔ یہ مستبدانہ اور غاصبانہ نظام ان لوگوں کا خود قائم کردہ ہے۔ خدا اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ رزق کے سرچشمے تمام ضرورت مندوں کے لئے کھلے رہنے چاہئیں۔ خدا اپنی فطری بخشائشوں کے راستے میں پھاٹک نہیں لگا دیتا کہ ایک طبقے کو آگے بڑھنے دے اور دوسرے کے لئے راستہ روک دے۔ یہ جہانِ سعی و عمل ہے۔ یہاں قدر و قیمت سعی و عمل کی ہے پیدائشی نسبتوں کی نہیں۔ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ مفاد پرست گروہ اگر غلط نظام قائم کرتا ہے تو تم اس نظام کو الٹ سکتے ہو۔ یہاں کوئی تاریخی وجوب ایسا نہیں جو تمہیں اس نظام کو اُلٹنے سے باز رکھ سکے۔ اگر تم اپنی موجودہ پستی اور ذلت پر مطمئن ہو کر بیٹھے رہو گے تو تمہاری حالت اور بھی پست اور ذلیل ہوتی جائے گی۔ اگر تم ہمت کر کے اُٹھ کھڑے ہو گے تو رزق اور اقتدار کے خزانوں کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں آجائیں گی وسائلِ پیداوار کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہیں گی۔ لیکن دیکھنا! تم نے اُس وقت پھر غلط نظام قائم نہ کر دینا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ تمہارے صحیح نظام کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا محتاج اور محکوم نہیں ہو گا اور ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی باعزت طور پر پوری ہوتی رہیں گی اور محض انسان ہونے کی حیثیت سے ہر فرد کا احترام برقرار رہے گا۔ نہ کسی کے پاس دولت کے انبار جمع ہوں گے اور نہ ہی دولت صرف اوپر کے طبقے میں گردش کرتی رہے گی۔ اس نظام کو اپنے حلقے تک ہی محدود نہ رکھنا، اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتے چلا جانا کیونکہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں، اس لئے اس باب میں اپنے اور بیگانے کا فرق کچھ معنی نہیں رکھتا۔

ہم پوچھتے ہیں اپنے اس کمیونسٹ نوجوان سے کہ کیا یہ تصوّر غریبوں اور کمزوروں کے لئے افیون ہے یا افیون زدہ انسان کو ہوش میں لانے کا تریاق ہے؟

اس کے بعد ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ مارکسزم کے مادی فلسفے کی رُو سے انسان اپنے ماحول (بلکہ معاشی نظام) کی پیداوار ہوتا ہے۔ جس قسم کا ماحول (یا نظام) اپنی خیالات کا حامل انسان — انسان اپنے ماحول سے آگے نکل نہیں سکتا ہے۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا یہ تصورات (جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) اُس ماحول (بلکہ اُس زمانہ) کی پیداوار ہو سکتے ہیں جس میں یہ پیش کیے گئے تھے؟ کیا اُس زمانے میں کسی انسان کے حیطۂ خیال میں بھی یہ باتیں آسکتی تھیں؟ کیا آپ تاریخ کی کوئی شہادت پیش کر سکتے ہیں کہ اس زمانے میں کسی اور نے بھی اس قسم کے نظریات اور نظام کا تصور دیا ہو؟ جب اِس (عظیم شخصیت) سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے ان تصورات کا سرچشمہ کیا ہے تو اس (صلعم) نے کہا کہ یہ میرے اپنے خیالات نہیں۔ مجھے ان کا علم خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے؟ ہم آپ سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں آپ کے پاس وہ کون سی دلیل ہے جس کی رو سے آپ یہ کہنے کی جرأت کریں کہ اُس (بلند و بالا شخصیت) کا یہ دعویٰ (معاذ اللہ) صحیح نہیں تھا۔ آپ کس بنا پر ایسا کہہ سکتے ہیں؟ آپ کہیں گے کہ آپ ماورائے طبیعات (SUPRA PHYSICAL) کسی شے کو نہیں مانتے۔ اوّل تو یہ دیکھئے کہ یہ کون سی دلیل ہے کہ جس چیز کو آپ نہ مانتے ہوں اس کا وجود ہی نہ ہو؟ دوسرے یہ کہ جس چیز کو آپ تاریخی وجوب کہتے ہیں وہ کون سی طبیعاتی چیز (PHYSICAL THING) ہے؟ وہ بھی طبیعات سے بالا کوئی شے ہے۔ اور اُسے آپ اس قدر صاحبِ قوت مانتے ہیں کہ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص کہدے کہ وہ خدا کا قانون ہے جسے اس قسم کی قوت حاصل ہے تو یہ بات قابلِ اعتراض کیوں سمجھی جائے؟

اب دیکھئے کہ تاریخی وجوب اور خدائی قانون میں فرق کیا ہے۔ تاریخی وجوب ایک اندھی قوت ہے جسے اس سے کوئی غرض اور واسطہ نہیں کہ انسانیت تباہ ہوتی ہے یا محفوظ رہتی ہے۔ اس نے صدیوں تک نظام سرمایہ داری قائم رکھا۔ جس کے تابع مظلوم انسانیت بلکتی اور تڑپتی رہی لیکن اس نے اس نظام کو نہ خود ہی بدلا اور نہ ہی غریبوں کو اس کی اجازت دی کہ وہ اسے بدل ڈالیں۔ اب اشتراکی نظام کی باری ہے۔ اس کے بعد پھر سرمایہ دارانہ نظام کی باری آجائے گی۔ پھر انسانیت چیخے چلّائے گی لیکن تاریخی وجوب ان کی ایک نہیں سُنے گی۔ وہ ہزار کوشش کریں کہ اُس غاصبانہ نظام کو نہ آنے دیں، وہ آکر رہے گا۔

اس کے برعکس، قرآن مجید نہ تاریخی وجوب کا جبر سکھاتا ہے اور نہ ہی مادی جدلیت کی گردشِ دولابی۔ وہ ایک غیر متبدل قانون دیتا ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷) "دنیا میں وہ نظام باقی رہے گا جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو"۔ اس قسم کا نظام جو قوم جس وقت چاہے قائم کر سکتی ہے۔ قرآن مجید اس نظام کے خط و خال بھی بیان کرتا ہے اور اس قوم کے افراد کی خصوصیات بھی جن کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہو سکتا ہے اس باب میں انسانوں کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ جب جی چاہے اسے قائم کریں جب وہ قوم اسے قائم کرے تو (تاریخی وجوب جیسی) کوئی خارجی قوت ایسی نہیں جو اسے منہدم کر دے۔ انسانوں کے ہاتھوں ہی میں سے یہ قائم ہوگا اور انہی کی غفلت شعاری یا بے راہ روی سے یہ انحطاط پذیر ہوگا۔ اس کا نصب العین کسی خاص گروہ، خاص جماعت خاص قوم یا خاص مملکت کی منفعت نہیں ہوگا۔ یہ الناس کی منفعت کے لئے قائم ہوگا۔ یعنی عالمگیر انسانیت کی منفعت اس کا مطمحِ نظر ہوگا۔ "منفعت" میں صرف "روٹی" نہیں آتی۔ انسانیت کی پرورش اور نشوونما کے لئے جو کچھ درکار ہو وہ سب اس میں شامل ہوتا ہے اس قسم کی منفعت سب کے لئے ہوگی اور بلا مزد و معاوضہ ملے گی۔

یہ ہے اس خدا کا متعین فرمودہ نظام جس سے ہمارے کمیونسٹ نوجوان اس طرح دور بھاگتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ قرآن مجید خدا کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔

(۱۹۶۱ء)

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۱۶ اکتوبر تا ۱۳ دسمبر ۱۹۸۰ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر	اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم			محترم		
۱۔ محمد دین چوہدری صاحب بوہلیل معرفت بزم طلوع اسلام - لندن	۱۱۸/۷۵	۳۶۶۸	۲۵۔ سید مقسوم علی شاہ صاحب اچھرہ - لاہور	۱۵۰/-	۳۶۹۲
۲۔ غلام عباس جعفر صاحب - ویمبلے	۱۱۸/۷۵	۳۶۶۹	۲۶۔ محترمہ مسز حمیدہ شجاع صاحبہ - اسلام آباد	۱۰۰/-	۳۶۹۳
۳۔ علی اختر صاحب - ڈانٹم سٹو ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۷۱۲/-	۳۶۷۰	۲۷۔ مسز زبیدہ مشرف صاحبہ - اسلام آباد	۱۰۰/-	۳۶۹۴
۴۔ احباب ساؤتھ ویمبلڈن ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۹۸۰/-	۳۶۷۱	۲۸۔ بیگم چوہدری عبدالکریم صاحبہ - ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۶۹۵
۵۔ ڈاکٹر قادر صاحب ساؤتھ لندن ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۱۸/۷۵	۳۶۷۲	۲۹۔ چوہدری فضل داد صاحب معرفت بزم طلوع اسلام - گجرات	۲۴/-	۳۶۹۶
۶۔ محترمہ مسز صدیقی صاحبہ کولنڈیل لندن ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۷۱/۲۵	۳۶۷۳	۳۰۔ قریشی محمد زمان صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۰۰/-	۳۶۹۷
۷۔ مسز سعید اختر صاحبہ ٹنی لندن ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۱۸/۷۵	۳۶۷۴	۳۱۔ عمر فاروق اچھا صاحب معرفت بزم طلوع اسلام - ٹورنٹو کینیڈا	۱۴۱۴/-	۳۶۹۸
۸۔ مسز بی جاوید صاحبہ ساؤتھ لندن ؍ ؍ ؍ ؍	۵۹۳/-	۳۶۷۵	۳۲۔ قاسم اے اچھا صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۸۲۸/-	۳۶۹۹
۹۔ مسز ناہید قریشی صاحبہ ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۵۹۳/-	۳۶۷۶	۳۳۔ سلیم اے اچھا صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۴۱۴/-	۳۷۰۰
۱۰۔ والی علی صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۳۰/۷۵	۳۶۷۷	۳۴۔ بلال ابراہیم اچھا صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۶۶/-	۳۷۰۱
۱۱۔ الہام محی الدین صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۲۳۷/-	۳۶۷۸	۳۵۔ عمر نور محمد صاحب معرفت بزم طلوع اسلام کراچی	۲۰۰/-	۳۷۰۲
۱۲۔ مقبول محمود فرحت صاحب - لندن ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۳۵۰/-	۳۶۷۹	۳۶۔ تنویر احمد صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۵۰۰/-	۳۷۰۳
۱۳۔ خواجہ خدا بخش صاحب معرفت بزم طلوع اسلام - پنڈدادن خان	۲۰۰/-	۳۶۸۰	۳۷۔ نثار علی صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۵۰/-	۳۷۰۴
۱۴۔ حافظ عبدالمجید صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۵۰/-	۳۶۸۱	۳۸۔ عمر عثمان صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۵۰/-	۳۷۰۵
۱۵۔ نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے - لاہور	۳۰۰/-	۳۶۸۲	۳۹۔ منصور خان صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۲۰۰/-	۳۷۰۶
۱۶۔ محترمہ مسز ظفر سعید صاحبہ - سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۶۸۳	۴۰۔ طاہر ابرار صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۰۰/-	۳۷۰۷
۱۷۔ ملک محمد سلیم صاحب معرفت بزم طلوع اسلام - راولپنڈی	۱۰۰/-	۳۶۸۴	۴۱۔ محمد اکرم راٹھور صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۲۰۰/-	۳۷۰۸
۱۸۔ محمد صادق صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۰۰/-	۳۶۸۵	۴۲۔ محمد جمال صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۰۰/-	۳۷۰۹
۱۹۔ عبدالمجید صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۵۰۰/-	۳۶۸۶	۴۳۔ ملک حنیف وجدانی صاحب - سنیل سیداں - مری	۵۰/-	۳۷۱۰
۲۰۔ چوہدری عبدالحمید صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۰۰/-	۳۶۸۷	۴۴۔ ڈاکٹر محمد اکرم صاحب معرفت بزم طلوع اسلام - متہ جیمین	۱۰۰/-	۳۷۱۱
۲۱۔ ملک ظہور احمد صاحب ؍ ؍ ؍ ؍ ؍	۱۰۰/-	۳۶۸۸	۴۵۔ محترمہ بیگم حلیم خان صاحبہ معرفت بزم طلوع اسلام - لاہور	۵۰/-	۳۷۱۲
۲۲۔ محمد ارشد صاحب ٹیچر - چارہان مری	۲۵/-	۳۶۸۹	۴۶۔ خان محمد صدیق خان صاحب - ملتان چھاؤنی	۴۰/-	۳۷۱۳
۲۳۔ منشی نذیر احمد صاحب - مامکے گجرات	۱۰۰/-	۳۶۹۰	۴۷۔ محمد جان صاحب - کویت	۷۳۱/-	۳۷۱۴
۲۴۔ مرزا علی احمد بیگ صاحب - اچھرہ - لاہور	۱۵۰/-	۳۶۹۱	۴۸۔ محترمہ مسز لے خان صاحبہ - بحرین	۵۱۶/-	۳۷۱۵

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۴۹۔ محترمہ بیگم خسرو کرامت علی صاحبہ معرفت بیگم ممتاز جہاں قریشی صاحبہ - لاہور	۷۰۰/-	۳۷۱۶
۵۰۔ عرفان عباسی صاحب واتھم سٹو بذریعہ سلیم اختر معرفت بزم طلوع اسلام - لندن	۳۰۰/۱۵	۳۷۱۷
۵۱۔ محمد غوث صاحب (″)	۲۳۶/۵۰	۳۷۱۸
۵۲۔ سلیم اختر صاحب (″)	۴۷۳/-	۳۷۱۹
۵۳۔ راجہ مشتاق احمد صاحب (″) بذریعہ علی اکبر راجہ	۹/۲۵	۳۷۲۰
۵۴۔ شوکت علی صاحب (″)	۱۸/۲۵	۳۷۲۱
۵۵۔ محمد گلزار کیانی صاحب (″)	۱۱۸/۲۵	۳۷۲۲
۵۶۔ محمد اعظم صاحب (″)	۷۶/۹۵	۳۷۲۳
۵۷۔ عبدالمجید صاحب (″)	۴۷/۳۰	۳۷۲۴
۵۸۔ رحیم بخش صاحب (″)	۴۷/۳۰	۳۷۲۵
۵۹۔ نصیر احمد قریشی صاحب (″)	۴۷/۳۰	۳۷۲۶
۶۰۔ مشتاق احمد صاحب (″)	۴۷/۳۰	۳۷۲۷
۶۱۔ ملک اکرام ابراہیم کاظمی صاحب نائیجیریا بذریعہ چوہدری محمد شفیع مہوٹلو	۴۷۳/-	۳۷۲۸
۶۲۔ سراج اسلام صاحب بذریعہ وکنگ کا محمد حمید صاحب	۲۳/۰۵	۳۷۲۹
۶۳۔ مظفر احمد صاحب ڈربیلٹن	۲۳۶/۵۰	۳۷۳۰
۶۴۔ سلیم انصاری صاحب تو نیٹا در تھلنڈ بذریعہ حبیب احمد صاحب	۵۹۱/۲۵	۳۷۳۱
۶۵۔ راجہ علی صاحب ساوتھ لنڈن	۱۱۸/۲۵	۳۷۳۲
۶۶۔ روشن علی عباسی سیکیلے لندن	۴۷۳/-	۳۷۳۳
۶۷۔ علی اختر صاحب معرفت بزم طلوع اسلام - لندن	۲۱۲/۹۰	۳۷۳۴
۶۸۔ مقبول محمود فرحت صاحب	۲۷۸/۴۰	۳۷۳۵
۶۹۔ عبدالمجید صاحب بذریعہ طارق عزیز	۱۱۸/۲۵	۳۷۳۶
۷۰۔ شاہین بٹ صاحب (″)	۱۱۸/۲۵	۳۷۳۷
۷۱۔ احباب کویت معرفت محترم محمد عمر دراز خاں صاحب بزم طلوع اسلام - کویت	۷۰۰۰/-	۳۷۳۸
۷۲۔ ماسٹر امام بخش صاحب - دراہن تونسہ (ڈی۔ آئی۔ خان)	۱۰۰/-	۳۷۳۹

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۷۳۔ عبدالواحد راعین صاحب - ٹنڈو محمد اولیا آباد (نواب شاہ)	۲۰۰/-	۳۷۴۰
۷۴۔ پوردل عرف صدر بابا صاحب - ترکئی	۵۰/-	۳۷۴۱
۷۵۔ ملک محمد حنیف ہمدانی صاحب - مری	۵۰/-	۳۷۴۲
۷۶۔ محترمہ مسز ظفر سعید صاحبہ - سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۷۴۳
۷۷۔ بیگم محمد مہدی عبدالکریم صاحبہ - ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۷۴۴
۷۸۔ بزم طلوع اسلام لاہور چھاؤنی - لاہور چھاؤنی	۳۰۰/-	۳۷۴۵
۷۹۔ احباب کویت معرفت محمد عمر دراز خاں صاحب بزم کویت - کویت	۵۰۰۰/-	۳۷۴۶
۸۰۔ محترمہ زینب فیض محمد صاحبہ میانوالی معرفت بزم طلوع اسلام - فیصل آباد	۲۰۰۰/-	۳۷۴۷
۸۱۔ گلزار احمد صاحب	۳۰/-	۳۷۴۸
۸۲۔ عبدالغفور صاحب	۱۰/-	۳۷۴۹
۸۳۔ عبدالاحد صاحب - زیدہ (مردان)	۳۰/-	۳۷۵۰
۸۴۔ محمد عالم صاحب - دوحا قطر	۱۰۰/-	۳۷۵۱
۸۵۔ سکواڈرن لیڈر محمد منیر صاحب - ظہران سعودی عرب	۱۰۰۰/-	۳۷۵۲
۸۶۔ محترمہ مسز زبیدہ مشرف صاحبہ - اسلام آباد	۱۰۰/-	۳۷۵۳
۸۷۔ محترمہ بیگم غلام عباس جعفری معرفت سکینہ معرفت بزم طلوع اسلام - لندن	۱۱۷/۱۵	۳۷۵۴
۸۸۔ محمد انور صاحب بریڈفورڈ بذریعہ رشید بٹ بریڈفورڈ	۲۳/۴۳	۳۷۵۵
۸۹۔ ایم پرویز (″)	۲۳/۴۳	۳۷۵۶
۹۰۔ راجہ لیاقت علی صاحب (″)	۲۳/۴۳	۳۷۵۷
۹۱۔ شوکت علی صاحب	۲۳/۴۳	۳۷۵۸
۹۲۔ محمد گل بہار صاحب (″)	۲۳/۴۳	۳۷۵۹
۹۳۔ محمد حنیف کیانی صاحب (″)	۴۶/۸۶	۳۷۶۰
۹۴۔ خالد محمود صاحب (″)	۲۳/۴۳	۳۷۶۱
۹۵۔ بشرف الٰہی صاحب	۱۱۷/۱۵	۳۷۶۲
۹۶۔ رشیدہ احمد صدیقی صاحبہ	۱۱۷/۱۵	۳۷۶۳
۹۷۔ ایم اے اعوان صاحب مالونہ ملٹی ایکسپریس بذریعہ حبیب اللہ صاحب	۴۶۸/۶۰	۳۷۶۴
۹۸۔ جبین الطاف صاحبہ مالونہ لندن	۲۳۴/۳۰	۳۷۶۵

محترم

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
۹۹۔ (TWENTY FOUR HOURS SERVICE) SAYS WATER بذریعہ حبیب جان معرفت بزم طلوع اسلام۔ لندن	۲۲۴۳/-	۳۷۶۶
۱۰۰۔ جمیل احمد صاحب و ثناء اللہ بذریعہ حبیب جان معرفت بزم طلوع اسلام۔ لندن	۴۶/۸۶	۳۷۶۷
۱۰۱۔ عبدالمجید صاحب بذریعہ علی اختر صاحب " " " "	۴۶/۸۶	۳۷۶۸
۱۰۲۔ چوہدری اللہ دتہ صاحب " " " "	۴۶/۸۶	۳۷۶۹
۱۰۳۔ محترمہ کوثر پروین صاحبہ " " " "	۲۳۴/۳۰	۳۷۷۰
۱۰۴۔ ولایت بیگم صاحبہ " " " "	۳۵۱/۴۵	۳۷۷۱
۱۰۵۔ چوہدری محمد رفیق صاحب (CHELMS FORD) بذریعہ غلام محمد عظیم صاحب معرفت بزم طلوع اسلام لندن	۱۱۷/۱۵	۳۷۷۲
۱۰۶۔ محترمہ صغراں بی بی " " " "	۱۱۷/۱۵	۳۷۷۳
۱۰۷۔ چوہدری اشتاق احمد صاحب " " " "	۱۱۷/۱۵	۳۷۷۴
۱۰۸۔ علی اختر صاحب وانتظم سٹو معرفت بزم طلوع اسلام۔ لندن	۴۶۸/۶۰	۳۷۷۵
۱۰۹۔ محمود الحسن رازی صاحب لندن " " " "	۵۸۵/۷۰	۳۷۷۶
۱۱۰۔ محترمہ مسز مونیکا رازی صاحبہ " " " "	۲۳۴/۳۰	۳۷۷۷
۱۱۱۔ سلیم اختر صاحب وانتظم سٹو " " " "	۳۵۱/۴۵	۳۷۷۸
۱۱۲۔ مقبول محمود فرحت صاحب " " " "	۲۳۴/۳۳	۳۷۷۹

محترم

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
۱۱۳۔ میجر محمد اکرم خان صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ لاہور چھاؤنی	۱۰۰/-	۳۷۸۰
۱۱۴۔ صوبیدار میجر (ریٹائرڈ) فتح خان صاحب نمبردار ملک پور چھپڑ معرفت بزم طلوع اسلام۔ گجرات	۲۰۰/-	۳۷۸۱
۱۱۵۔ یوسف علی ضیا صاحب۔ ملتان	۱۰۰۰/-	۳۷۸۲
۱۱۶۔ ملک علم دین صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ کمالیہ	۱۰۰۰/-	۳۷۸۳
۱۱۷۔ صوبیدار عبدالمجید صاحب (ریٹائرڈ) " " " "	۱۶۰۰/-	۳۷۸۴
۱۱۸۔ عبدالخالق صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ کراچی	۲۰۰/-	۳۷۸۵
۱۱۹۔ نور محمد رحمت اللہ صاحب " " " "	۱۲۰/-	۳۷۸۶
۱۲۰۔ بخارس خان صاحب " " " "	۸۰/-	۳۷۸۷
۱۲۱۔ محمد صدیق صاحب " " " "	۳۰/-	۳۷۸۸
۱۲۲۔ امین اللہ رحمت اللہ صاحب " " " "	۸۰/-	۳۷۸۹
۱۲۳۔ چوہدری نصراللہ خان صاحب۔ چک ۱۵ شمالی	۱۰۰۰/-	۳۷۹۰
۱۲۴۔ عبدالحلیم خان صاحب معرفت بزم طلوع اسلام۔ [illegible]	۵۰/-	۳۷۹۱

میزان = ۵۶۰۹۳/-

سابقہ میزان = ۵,۹۹۱۹۰/۶۵

کل میزان = ۶,۴۸,۲۸۳/۶۵

(بقیہ۔ درسِ قرآن۔ صفحہ ... سے آگے)

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ۔

پنج کسی (تحصیل کبیر والا ضلع ملتان) میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام

ایبٹ آباد میں ہر اتوار ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر غلام مصطفےٰ اعوان ایڈووکیٹ

ہنگو میں ہر جمعہ ۱/۲ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) بر مکان محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۶۷)

سرگودھا میں ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۳۷ "نظامی منزل"

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) حیات سرجیکل کلینک ۳۲ ہیلے کالونی نمبر ۱۔ فون 27455

بہاولپور میں (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ باہتمام ڈاکٹر (ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
۱۔ ۸ بجے صبح رحمانی خیراتی شفاخانہ غنی پورہ
۲۔ ۳ بجے سہ پہر بعد نماز جمعہ بمکان اعظم سنز، مچھلی بازار

کوئٹہ میں (بذریعہ ٹیپ) باقاعدگی سے ہفتہ وار
رابطہ کے لئے: ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ پر
[illegible]